# تصوفِ اقبال

از

جنابہ محترمہ حبیب النساء بیگم صاحبہ

یم اے (پرشین میسور یونیورسٹی) یم اے (اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

محکمۂ فارسی و اردو۔ جامعہ میسور۔ مہارانیس کالج بنگلور۔

---



طبع اول (۱۹۵۰ء) الکلام برقی پریس بنگلور سٹی قیمت مجلد [illegible] روپیہ



علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

1st July, 1937.

Madam,

I am extremely sorry to say that I have got no copy of the book you mentioned in your letter. It was written more than 30 years ago, and I fear it must be antiquated and out of print by this time. However, you can write to the publishers — Messrs Luzac & Co, Oriental Book-Sellers, opposite the British Museum London — and enquire whether they can supply a copy.

An Urdu translation of the book was published some months ago in Hyderabad. I am sorry to say that I do not know the name and the address of the translator.

Yours Sincerely.

Mohammad Iqbal.

---

یہ اس خط کا عکسی فوٹو ہے جو علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ
نے "تصوف اقبال" کے مصنفہ کے نام لکھا تھا

# عرضِ حال

آج سے نو سال قبل جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن
کے اردو امتحان ایم۔ اے کی تیاری کے سلسلے میں میں نے ایک مقالہ
بعنوان "اقبال کی تصانیف میں تصوف کا عنصر" لکھا تھا۔
میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی نگرانی کے لئے عالیجناب ڈاکٹر سجاد حسین صاحب
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اردو پروفیسر جامعۂ عثمانیہ جیسے قابل اور
لائق و فائق استاد مقرر کئے گئے۔ اور خاکسار کو آپ جیسی عظیم المرتبت
ہستی کے گراں قدر خدمات سے مستفیض ہونے کا موقع میسر ہوا۔
آپ نے جس شوق اور دلچسپی سے اس کام میں میری مدد فرمائی۔ اس
کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ قاصر ہیں۔ کفرانِ نعمت ہوگا اگر اس
موقع پر عالیجناب عبد القادر صاحب سروری اردو پروفیسر کی امداد و
اعانت کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے ازراہِ مہربانی اس پر نظرِ ثانی کی
زحمت گوارا کر کے مرہونِ احسان بنایا۔ دراصل آپ کے ہی مشورے
اور مدد سے آج یہ مقالہ کچھ ردوبدل کے ساتھ کتابی صورت میں
"تصوفِ اقبال" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ

میں ان تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنہوں نے اس پر تبصرے لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی اور جن کے خیالات گرامی اس کتاب کی زینت کا باعث بنے۔

اس کتاب کی اشاعت و طباعت عالی جناب حکیم الملک سید غوث محی الدین صاحب کی رہین منت ہے۔ جناب محترم اپنی علم دوستی اور جذبۂ خدمت گزاری کی وجہ سے کافی مشہور اور نیکنام ہیں اور ہمیشہ اردو کے پاکیزہ لٹریچر کی اشاعت کیلئے مستعد و آمادہ رہتے ہیں۔ لہٰذا آپ حضرات کی خدمت میں خلوص دل سے شکریہ کے یہ چند الفاظ پیش کرتی ہوں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

تصوف اقبال میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے۔ وہ تمام تر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے ہی اخذ کیا ہے۔ اور حتی الامکان اس کتاب کو عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں اور کم مائیگی کا اعتراف ہے۔ تاہم یقین کامل ہے کہ یہ کتاب اصحاب ذوق کے پاس شرف قبولیت حاصل کریگی۔

حبیب النساء بیگم

1-5-1951.

# پیش لفظ

رقم زدہ کلیم الملک جناب غوث محی الدین صاحب مدیر روزنامہ الکلام بنگلور

## جنابہ محترمہ حبیب النسا بیگم صاحبہ کی تصنیف

"تصوف اقبال" کے لئے پیش لفظ میں نہایت مسرت کے ساتھ لکھ رہا ہوں وجہ یہ ہے کہ اپنے زمانۂ طالب العلمی سے آج تک محترمہ حبیب النسا بیگم صاحبہ تعلیم نسواں کی ترقی کے متعلق گراں قدر مضامین بغرض اشاعت روزنامہ الکلام کو روانہ کرتی رہی ہیں۔ ریاست میسور کی آپ وہ پہلی خاتون ہیں جو میسور یونیورسٹی میں فارسی میں ید طولیٰ حاصل کرکے ایم اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی نے آپ کو اردو میں ایم اے کی ڈگری سے مفتخر فرمایا۔ چنانچہ یہ تصنیف آپ کی ریسرچ اور تبحر علمی کی شاہکار ہے۔

علامہ اقبالؒ نے تصوف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لئے ایک مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ تصوف کے متعلق علامہ اقبال کے اچھوتے خیالات کو اس قدر تحقیق، تجسس اور دماغ سوزی کے ساتھ منظر عام پر لانے کے لئے محترمہ موصوفہ نے جو کوشش بلیغ کی ہے وہ سراسر قابل داد اور لائق تحسین ہے۔

علاوہ بریں علامہ اقبالؒ سے مجھے ذاتی طور پر گہرے تعلقات رہے ہیں اور جنوبی ہند میں اقبالؒ کے کلام کی اشاعت کے لئے گزشتہ ربع صدی سے انکلام کے ذریعہ میں نے حتی الامکان جو خدمت کی ہے اس کے مدنظر تصوف اقبال کے لئے پیش لفظ لکھتے ہوئے علامہ اقبال کے ایک سچے فدائی اور شیدائی کی حیثیت سے مجھے بجا طور پر ناز اور افتخار حاصل ہے۔ اور میں اُردو داں پبلک سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ تصوف اقبال کا گہرے طور پر مطالعہ کرکے مصنفہ کی ریسرچ اور دماغ سوزی کی داد دیں

اگر یہ کتاب کالجوں کی اعلیٰ جماعتوں اور مدارس اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کی جائے تو یقیناً نونہالان ملک کو فوائد بے کراں حاصل ہوں گے۔

سید غوث محی الدین

بنگلور
۱۰/ اگست ۱۹۵۰ء

# تصوفِ اقبالؒ کے متعلق

## آنریبل جناب سید محمود صاحب وزیر ترقیٔ مواصلات صوبہ بہار کی رائے

جناب محترمہ بیگم صاحبہ ! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ مع آپکی قابل قدر تصنیف "تصوف اقبالؒ" ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں عدیم الفرصتی کے باعث اُسے دیکھ نہ سکا اور آپ کا والا نامہ بھی کتاب ہی میں رہ گیا اب میں نے جب کتاب اٹھائی تو آں محترمہ کا عنایت نامہ بھی ملا۔ جواب میں دیر ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن میری مشغولیت کا خیال کرکے امید ہے آپ خود مجھے معاف کردینگی۔

میں نے تصوف اقبالؒ کو ادھر اودھر سے دیکھا۔ آپ نے تو گویا خود تصوف ہی کی ایک مختصر جامع تاریخ لکھدی ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی ہے۔ آپ نے کیا خوب نکتہ نکالا کہ "صرف انسان ہی خدا کا طالب نہیں۔ بلکہ خدا بھی انسان کا جویا اور وصال انسانی کے لئے بے تاب ہے۔

اس ایک نکتہ سے آپ نے نہ صرف فلسفہ و تصوف کے بعض مسایل حل کردئے بلکہ خود کائنات

ہستی کے بعض رازوں کو بھی افشا کر دیا۔ عراقی اپنے والہانہ انداز میں کہتے ہیں ؎

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بد نام کردند

اور پھر کہتے ہیں ؎

دم بدم در ہر لباسے رُخ نمود
لحظہ لحظہ جائے دیگر پا نہاد
بر مثالے خویشتن حرفے نوشت
نام آں حرف آدمؑ و حوّا نہاد
ہم بہ چشم خود جمالے خود بدید
تہمتے بر چشم نابینا نہاد

بقول اقبالؒ "انسان صفاتِ الٰہی کا حامل ہے" اور جب یہ بار پہاڑ و دریا و آسمان کسی سے نہ اُٹھ سکا تو انسان کے سپرد ہوا ؎

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

سائینس خارجی اشیاء سے رازِ ہستی پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ برعکس اس کے تصرف انسان ہی کہ ذریعہ رازِ ہستی کا جویاں ہے۔ کیونکہ انسان صفاتِ الٰہی کا حامل ہے۔

غرضیکہ اقبالؒ کے تصوف کی تشریح آپ نے

بڑی خوبی سے کی ہے۔

اقبالؒ کے تصوف کا بیان اور اُس کی تشریح اس سے زیادہ بہتر اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔

میں اس تصنیف پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ انشاءاللہ تعالیٰ اس کتاب کو لفظاً لفظاً پڑھوں گا۔

اس وقت سفر میں ہوں اور ریل میں یہ چند سطور سرسری طور پر لکھ رہا ہوں۔

زیادہ والسّلام
خاکسار
سیّد محمود

---

## مولانا مولوی جناب اسلم جیراج پوری کی رائے

محترم دام لطفہا۔

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ آپ کی بھیجی ہوئی کتاب تصوف اقبالؒ موصول ہوئی۔ ممنون ہوں۔ ان دو تین دنوں میں میں نے اس کا بڑا حصّہ مطالعہ کیا۔ اقبالؒ کے تصوف کی خود ان کے کلام سے آپ نے جس طرح تشریح کی ہے وہ بہت قابلِ تعریف ہے۔ آپ نے

اپنی کوشش سے ان صوفیانہ معلومات کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ جس سے اقبالؒ کے کلام پر لکھنے والوں کو بہت مدد مل سکتی ہے۔ چونکہ ایک ہی یعنے صوفیانہ نظریہ ہی کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس لیئے ٹھوس ہو گئی ہے۔

ایسی کتابوں میں تنوع سے جو لطافت پیدا ہوتی ہے وہ اس میں پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن بہر صورت اس خاص نظریے اقبالؒ کو دیکھنے والوں کے لیئے یہ کتاب کار آمد ہے۔ والسّلام

محمد اسلم جیراج پوری
جامعہ نگر۔ دھلی
۶ ر مئی ۱۹۵۰ء

# تصوفِ اقبال

یہ تبصرہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے پندرہ روزہ اخبار قومی زبان بابت یکم اگست ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے

محترمہ حبیب النساء بیگم ایم اے، معلمہ مہارانی کالج بنگلور) کی یہ کتاب پڑھ کر، جو عام اشاعت سے پہلے رائے کے لئے مجھے بھیجی تھی، میں بہت خوش ہوا اور دولت میسور میں کلام اقبال کو نہ صرف محنت و شوق سے بلکہ نئے نئے زاویوں سے سمجھا اور سمجھایا جارہا ہے۔ لائق مصنفہ نے شاعری کی طرح ان کے تصوف کے بھی چار دور قائم کئے ہیں اور ہر دور کی نظموں پر باریک بینی سے نظر ڈالی ہے۔ مصنفہ لکھتی ہیں کہ ابتداہی سے شاعر کی قلبی واردات بتاتی ہے کہ عام علوم اور سطحی فلسفہ سے اس کی جستجو کی پیاس نہیں بجھ سکتی تمثیل میں "شمع اور بچہ" اور ع : قصۂ دار ورسن بازی طفلانہ دل وغیرہ نظموں کو مصنفہ نے پیش کیا اور بڑی خوبی سے اقبال کی روحانی تلاش اور صوفیانہ حسیات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے کہ شائد پہلے کسی اقبال شناس کی ان پر نظر نہ پڑی تھی۔ تصنیف و تحریر کے اعتبار سے تیسرا دور سب سے بڑا اور اہم ہے جس میں اسرار خودی، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم اور مدراس کے خطبات لکھے گئے۔ مصنفہ نے ان سب کو اچھی طرح پرکھا اور ان کے معنوی نکات کا مطالعہ کیا۔ ان کی تقسیم میں ۱۹۳۰ء سے

اقبال کے تصوف کا چوتھا اور آخری دور شروع ہوتا ہے جس میں وہ خالص مصلح کی حیثیت اختیار کرتے اور مہانہ شان سے اپنا پیام سناتے ہیں۔ جاوید نامہ اس دور کا شاہکار ہے۔

فاضل مصنفہ نے پورے مطالعے کا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اقبال کا فلسفہ تصوف، اور تصوف فلسفہ تھا۔ اسی کو وہ مشرقی عقائد اور مغربی فلسفے کا "جاں بخش آمیزہ" قرار دیتی ہیں۔ آخر میں فلاسفہ کے نظریات کا خلاصہ اور اُن بزرگان صوفیہ کی تعلیم کا تذکرہ کیا ہے جن سے اقبال کم و بیش متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

غرض مصنفہ نے نہ صرف کلام اقبال پر غور کا ایک خاص پہلو بلکہ اس پر گہری نظر ڈالی اور سیر حاصل بحث بھی تحریر کی ہے۔ میں ان کی کتاب کی داد دعا سے دیتا ہوں کہ خدا کرے وہ ملک میں مقبول اور حبیب النسا بیگم کی محنت خاطرخواہ وصول ہوں امید ہے کہ کتابت کی غلطیاں احتیاط سے چن کر ایک صحت نامہ ضرور کتاب میں لگا دیا جائیگا۔

۷۸۶

# تصوف اقبال کے متعلق

## جناب علامہ محمد عباس صاحب شوشتری پرنسپال اورینٹل کالج لاہور کی رائے

عزیزم حبیب النساء بیگم! نامۂ شما کہ بنام (تصوف اقبال) بچاپ رسیدہ و برای بندہ فرستادہ اید بسبب ضعف بصار چنانکہ بایستی نتوانستم مطالعہ کنم ولی آنچہ را کہ خواندم بنہایت پسندیدم شکی نیست کہ شما زحمت کشیدہ آید و خدمت بزرگی بادبیات فارسی و اردو نمودہ اید و افکار مرحوم سر محمد اقبال را بہتر از برخی دیگر کہ شرح زندگی اورا نوشتہ و انتشار دادہ اند دانستہ اید بعقیدۂ بندہ سر محمد اقبال چناں بودہ کہ شما در "خاتمۂ" نامہ از او نوشتہ اید۔ مرحوم اقبال نہ فیلسوف کامل بود و نہ صوفیٔ باعمل بلکہ میتوان گفت کہ در سیاست نیز دلبستگی محدود داشت ولی شکی نیست کہ دل او پر از درد بود و میخواست راہی بجوید کہ مسلمین چنانکہ شما اشارہ کردہ اید از زبونحالی و تن پروری و پستی درآیند و بگمانم اندیشہ او با نتیجہ شد و اشعار او اثر خود را نمودند۔ امروز جوش و خروش کہ درمیان ہم میہنان او می یابیم در اثر اشعار او می باشد۔ افکار

عارفانهٔ اقبال آمیزش از فکر شرق و غرب است وابسته که آمیزش‌ها بسیار خوبست و انتشار آن در این عصر بسیار لازم بوده است.

از موازنه ایکه شما از تصوف اقبال و مفکرین مغرب و متصوفین مشرق نموده اید استفاده کردم و بسیار پسندیدم و امید دارم که همه خوانندگان نامهٔ شما باب پنجم را بتأمل مطالعه کنند بنا بر نوشتهٔ شما در تصوف مولانای روم و عقائد اقبال مماثلت غیرعادیست وابسته اگر امتیازی هست در خصوصیت عصر است. مولانای روم شخص روحانی و یعنی حقیقی صوفی کامل بوده و زندگی او در عبادت و ریاضت و بحث و تدریس در گذشت ولی اقبال عارفی بوده که در آغوش فلسفه مغرب پرورش یافته و در محیط هند نشو و نما کرده است. اگر ما نوشتهٔ هر دو را بتأمل مطالعه بکنیم و باندیشه و راهنمائی آنها پی بریم گمان میکنم که از نواقص زندگی نجات خواهیم یافت.

باین مختصر شما را بنوشتن یک نامهٔ مفید و پر از اطلاعات علمی تبریک میگویم و امید دارم که در آینده نیز چنین نوشته‌ها موفق بشوید.

ارادتمند — عباس شوشتری

# تصوفِ اقبال

از

جنابہ محترمہ حلیب النسا بیگم صاحبہ

یم اے (پرشین میسور یونیورسٹی) یم اے (اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)
محکمۂ فارسی و اردو۔ جامعۂ میسور۔ مہارانیس کالج بنگلور

---



طبع اول (سنہ ۱۹۵ء)　　الکلام برقی پریس بنگلور سٹی　　قیمت فی مجلد تین روپے

# فہرست مضامین :-

## تمہید



## باب اوّل

# تمہید

سر اقبال کے تصوف نے اپنے زور بیان اور منطقی دلائل سے عقائد مروجہ کا رخ بدل دیا۔ حکومت اور سیاست کا اثر خیالات پر گہرا ہوتا ہے۔ غدر سے پہلے ہی دنیائے اسلام کے زوال و پستی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اکبر اور اورنگ زیب جیسی پر شان و شوکت ہستیوں کے وارث اجنبیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن چکے تھے۔ عوام نے ان مایوس کن حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن کیا کر سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ انتہائی یاس و بے بسی کی حالت میں کل واقعات کو تقدیر کے حوالے کر دیں اور صبر و تسلیم کو شیوہ بنائیں۔ اور اسی دور انقلاب میں مسلمانوں نے حکومت کے ساتھ ساتھ آزادی و مردانگی جیسی بہتی خوبیوں کو بھی کھو دیا اور اپنے فکر و فعل کی تائید میں ایک ایسے تصوف کے دامن میں پناہ لی جو عموماً صوفیائے متقدمین کے ۔ اور خصوصاً قرآن مجید کی تعلیمات کے برخلاف تھا اور جو کسی قوم یا حکومت کے زمانہ زوال سے مخصوص ہوتا ہے۔

ایران میں غارت گران تاتار کے حملے نے جس طرح ایرانی رجحانات میں انقلابات عظیم برپا کر دیا تھا۔ اس طرح ہندستان میں مغلوں........... کے زوال نے لوگوں کے خیالات

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے حکومتِ اسلامی کی کایا پلٹ دی۔ اور ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بھی بجھا دیا۔ عوام نے اس کو بھی مقتضائے تقدیر پر منحصر جانا لیکن ان کے درمیان سر سید جیسی ہستی بھی موجود تھی جس نے ان حالات سے متاثر ہوکر اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا۔ اور مسلمانوں کے جمود میں حرکت پیدا کر دی۔

آپ نے روحانی ترقی کی یک طرفہ توجہ پر احتجاج کی روحانیت کے ساتھ ساتھ ہی مادی ترقی پر بھی زور دیا۔ در اصل دور جدید غدر کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں نئے خیالات اور نئی امنگیں پیدا ہونے لگیں۔ ان کا زاویہ نظر وسیع ہوگیا۔ سر اقبال نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ علوم مغربی اور روایاتِ مشرقی دونوں کا بغور مطالعہ فرمایا۔ آپ نے مسلمانوں کی پریشاں حالت سے متاثر ہوکر اصلاح قومی کو اپنا نصب العین بنالیا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے سر اقبال نے میدان عمل میں قدم بڑھایا اور اس صدی کے ابتدائی زمانے کی نمائندگی کا سہرا آپ کے سر ہے۔ آپ نے سر سید کے مانند روحانیت کے یک طرفہ غلو کو غلط ثابت کیا۔ یعنی جس چیز کی داغ بیل سر سید نے ڈالی تھی اس کو اقبال نے پروان چڑھایا۔ مغربی تعلیم اقبال کے لئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ ایک طرف تو آپ نے تصوف مروجہ کے عقائد تقدیر۔ تسلیم و رضا اور بے عملی اور جمود کے خلاف

اعلان جنگ کیا۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کو یورپ کی اندھا دھند تقلید سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

اقبال کے عقائد کو سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ تصوف کی ماہیت اور مختلف مذاہب میں تصوف کی نمایاں خصوصیات کو سمجھ لیا جائے۔ اقبال کی تعلیمات قرآن مجید و احادیث پر مبنی ہیں صوفیائے کرام میں متقدمین نے بھی اپنے عقائد کی بناء قرآن مجید پر رکھی لیکن اسلام جب دور دراز ملکوں میں پھیلا تو وہاں کے مروجہ عقائد سے وہ بہت کچھ متاثر ہوا۔ خصوصاً مسلمانوں نے عیسائیوں اور ہندوؤں کے اثر سے قرآن مجید کی تعلیم "لا رہبانیت فی الاسلام" کو پس پشت ڈال دیا۔ اور متاخرین نے مذکورۂ بالا مذاہب کے زیر اثر اپنا ایک ایسا لائحہ عمل تشکیل دیا جو قرآن مجید کی تعلیم کے برخلاف تھا اور اقبال نے انھیں عقائد کے خلاف علم بغاوت بلند کی۔ اس لئے آئندہ چند اوراق میں مختلف مذاہب کے عقائد تصوف کا خصوصیات کا ذکر کیا جائیگا۔

اقبال کے عقائد تصوف، اسلامی عقیدہ تصوف کے نشوونما کا حال جاننے کے بغیر پورے طور پر واضح نہ ہو سکیں گے۔ چونکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال جب اپنے عقاید کو قرآن مجید و احادیث پر تعمیر کرتے تھے تو وہ کیوں دوسرے متصوفین کے خلاف ہیں جن کی مذہب پرستی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ بطور تمہید متقدمین و متاخرین کے عقائد تصوف کے اختلافات کو ظاہر کیا جائے اور بتایا جائے کہ اقبال تصوف مروجہ

کے کن کن پہلوؤں کے طرفدار ہیں اور کن کن افکار کے خلاف۔

## تصوف کا مفہوم

عموماً ہر مذہب میں ایسا گروہ موجود ہوتا ہے۔ جس کا نصب العین محض یادِ خدا اور پاکیزگیٔ اخلاق ہوتا ہے۔ احکام الٰہی کی پابندی، اور ممنوعات سے بچنا اور تزکیہ قلب اس کی لازمی شرطیں ہیں۔ متصوفین کا عقیدہ ہے کہ خدا کی سچی محبت اور طلب دل پر اتنی غالب ہو جانی چاہیئے کہ ماسوااللہ سے دل بے نیاز ہو جائے اور دنیا کے نفع اور ضرر کا اندیشہ سالک کے دل سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔

## تصوف ہندو مذہب میں

ہندوؤں کے قدیم ترین عقائد ویدوں میں مرقوم ہیں۔ رگ وید میں دنیاوی زندگی کو برا تصور نہیں کیا گیا ہے۔ ایک لفظ "تپس" (TAPAS فارسی تپش، بمعنی حرارت) موجود ہے۔ بعد میں یہ لفظ گرمیٔ عشق کے معنی میں لیا گیا۔ اور نفس کشی اور ریاضت کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ "اوپنیشاد" جس میں وید کے برخلاف دنیا کو سرچشمۂ آلام اور حیات انسانی کو زشت تصور کیا گیا اور عقیدۂ تناسخ کو کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی مناسبت سے خاص شکل میں اس دنیا میں دوبارہ پیدا کیا جاتا ہے۔ مخصوص جگہ دی گئی ہے۔ چونکہ حیات انسانی کو شر انگیز سمجھا گیا ہے۔

لہذا ہندوؤں نے تناسخ کو بدترین شر سمجھ کر قوت حکمت اور ریاضت سے رشتہ حیات کا منقطع کرنا زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ اور انسان کا عقیدہ ہے کہ افعال انسانی کی بناء خواہشات پر ہوتی ہے اور افعال ایک دور زندگی کے عالم وجود میں لانے کا باعث ہیں لہذا خواہشات کو معدوم کر دیا جائے۔ تاکہ انسان شر حیات سے محفوظ رہے۔

اوپنیشاد میں درجات تعلیم چار ہیں۔ برہما چاری جس میں انسان تحصیل علم میں مشغول ہوتا ہے۔ دوسرے درجہ گرہستی میں خدا کی عبادت و قربانی کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس درجہ کے طالب علم کو چاہیئے کہ قوانین اخلاق کی پابندی کرے۔ تیسرا درجہ زہد و ریاضت کا "وانا پرست" ہے۔ یعنی جنگل میں زندگی بسر کرنا۔ چوتھے درجے میں۔ انسان سنیاسی ہو کر کل لوازمات دنیوی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ ہندوؤں کی ایک اور کتاب "بھگوت گیتا" میں فلسفہ سانکھیا اور یوگ کا مجملاً ذکر کیا گیا ہے۔

اس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ نجات انسانی نہ علم و معرفت میں (سانکھیا) مضمر ہے۔ اور نہ عمل و ریاضت (یوگ) میں طالب حقیقت صرف "بھگتی" یعنی عشق، محبت کی راہ سے معراج کمال پر پہونچ سکتا ہے۔ اس لیئے دنیا سے کنارہ کش ہونے کی بجائے قوائے فطرت کو اپنا محکوم بنا کر اپنے فرائض کو بدوں اغراض ذاتی انجام دینا۔ اپنی توجہ کو ذات حقیقی کی طرف منعطف کرنا خوشی و غم میں ... یکسوئی اختیار کر کے نفس کو علائق دنیوی سے آزاد

بھلا دیا، اور عشق الٰہی میں محو ہو کر طمانیت قلب حاصل کرنا چاہیے۔
ہندوؤں کے فلسفہ کے چھ قوانین ہیں۔ یعنی پر وماسا۔ ویدانتا۔ سانکھیا۔ یوگا۔ ویشیشکا۔ نیایا۔ ان تمام قوانین میں نجات انفرادی کو زیادہ اہم تصور کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان کا فلسفہ بھی یونانیوں کی طرح ( RATIONALIST ) یا استدلالی ہے جن کی رو سے عقل کو عشق سے برتر اور اسکو مقصد حیات سمجھا گیا ہے لیکن ویدانتا میں خالق اکبر کی طرف روح کی بازگشت کو معراجِ سعادت اور دنیا کو سراب محض تصور کیا گیا ہے۔

رامانج۔ رامانند۔ کبیر۔ تلسی داس اور تکارام بھی عشقِ الٰہی کو مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کو عشقِ الٰہی کے ہمراہ اعمالِ نیک کو بھی توام بنانا چاہیے۔ یہ لوگ قوتِ عشق کے قائل ہیں اور اس مسئلے میں متصوفین اسلام سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی جو ادی برھما سماج کے پیرو ہیں معرفت، وصالِ حقیقت۔ دیا وصالِ الٰہی کو زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔

سوامی پرمانندا (۱۸۶۲ء-۱۹۰۲ء) بھی قانون ویدانندا کے پیرو ہیں۔ اور ان کا رجائیت کا عقیدہ سر اقبال کے عقیدے سے مشابہ ہے۔ وہ ایک جگہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔
"تم اللہ کے بچے ہو اور اس کی ابدی مہربانیوں کے حصہ دار۔ تم مقدس اور کامل ہو اور روئے زمین کے خالق۔ پھر تم کیونکر گنہگار ہو سکتے ہو۔ انسان کو گنہ گار سمجھنا دراصل

گناہ اور فطرت انسانی پر الزام لگاتا ہے۔ اسی خیال کو کہ تم بھیڑیوں کے مانند ہو۔ اپنے دل سے دور کر۔ تم کو کامل ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ تم فی الحقیقت کامل ہو (۱)

## بُودھ مذہب

اہل مغرب کے نزدیک بُودھ مذہب وجود الٰہی اور بقائے روح کا منکر ہے۔ اور مذہب عقل سے نامزد کیا گیا ہے۔ اس مذہب کا اساس "کرمہ" اور "تناسخ" پر قائم ہے۔ جس کی رو سے انسان اپنے اعمال کی مناسبت سے بعد مرگ دوبارہ خاص شکل میں پیدا ہونے پر مجبور ہے۔

پس اس مذہب میں زندگی کا مقصد زنجیر حیات سے آزادی ہے۔ بودھ مذہب میں زندگی از سرتاپا برائیوں سے پُر ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ نفس کشی اور ریاضت کو اپنا شیوہ قرار دے کر کل لذات دنیوی سے کنارہ کشی

---

(۱) داستان کرشنا مصنف پروفیسر ایم۔ اے۔ شوشتری میسور یونیورسٹی

(۲) HINDU ETHICS BY HOPKIN.

(۳) HINDU ETHICS BY MACKENZI

نیز پروفیسر بے۔ آر۔ واڈیا پرنسپل فلسفہ میسور یونیورسٹی کے متعدد لکچروں سے استفادہ حاصل کیا گیا۔

ہوجائے۔ لیکن اعمال سے دست بردار ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان اپنی کل خواہشات کا خاتمہ نہ کرے۔ نیز ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کل موجوداتِ عالم زندگی کے مصائب میں مبتلا ہیں۔ اور ان مصائب کا منبع عقیدہ خودی ہے۔ یعنی اپنی شخصیت کا یقین جو انسان کو حیات کی زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔ پس اپنی معدومیت یا بے وجودی کا علم بہترین خوبی ہے۔ اس کے برعکس اپنی بے وجودی سے ناواقف رہنا در اصل جہل ہے۔

حالت "نروانا" یا نجات کی تحصیل کے لئے لذات دنیوی سے احتراز لازمی ہے۔ وہ تمام اشیاء جو دنیاوی مسرت کا باعث ہوں بری ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کو نہ صرف اپنے عزیز و اقارب سے دوری اختیار کرنی چاہئے بلکہ انکی بہبودی کے کل خیالات کو بھی دل سے محو کر دینا چاہئے۔ پس اس عقیدہ کی رو سے ہر شخص اپنی اپنی نجات کا جویا ہوتا ہے۔ اس مذہب میں راہبوں کی ایک مخصوص انجمن ہوتی ہے۔ جن کے لئے انکی مقدس راستوں کی پیروی اور تین جوہر زندگی پر عمل ضروری ہوتا ہے۔ آٹھ مقدس راستے (۱) صحیح عقیدہ (۲) صحیح مقصد (۳) صحیح الفاظ (۴) صحیح گفتار (۵) صحیح پیشہ (۶) صحیح کوشش (۷) صحیح علم اور (۸) درست خیالی ہیں۔ تین جوہر (۱) بودھ کی زندگی کو نمونہ عمل بنانا (۲) جانوروں پر رحم کرنا (۳) انجمن کا رکن

ہونا۔ نیز کل خواہشات کا انقراض ہیں۔ عقیدہ خودی سے احتراز اور تفکر بھی راہبوں کے لئے ضروری ہے۔[1]

# جین مذہب

جین مذہب کے پیرو بھی بودھوں کے مانند زندگی و موت کے سلسلے کے خاتمے کو جو صرف انقطاعِ اعمال سے ممکن ہوسکتا ہے۔ نجات انسانی کا باعث سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے مقصد حیات "مکشا" یا طمانیت خاطر اور آسودگی روح ہے۔ جین مذہب میں بھی لذات دنیوی کو سختی سے منع کیا گیا ہے یہ عبادت۔ روزہ اور پاکیزگی و قانون بے آزادی (اہمسا) کی پیروی میں مذہب بودھ سے ملتا جلتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کو بد تصور کرکے موت کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں ان کے بعض راہبوں نے دنیا کو اس قدر نفرت کی نظر سے دیکھا کہ خودکشی تک کرلی ہے۔ ان کے اس فعل کو ان کے ہمذہب بہ نظر پسندیدگی دیکھتے ہیں۔

ہندوستان میں رہبانیت کا عقیدہ ایک پرانا عقیدہ ہے جو پیر یا گرو کے احترام تصور ... ۔ روزہ اور ریاضت

---

بدھ مذہب کے متعلق اول الذکر کتابوں کے علاوہ

(1) THE ETHICS OF GOUTMA BUDDHA

BY N.S. WARD. سے مدد لی گئی۔

...اور تبلیغ کے استعمال میں صوفیائے اسلام کے موافق ہے

## مذہب زردشت

دوسرا قدیم مذہب زرتشتیوں کا ہے۔ جس کی بناء ایران میں زردشت ناز رانے ڈالی تھی۔ ان کی کتاب "اوستا" ہے۔ یہ نیکی و بدی کی دو مختلف اور متضاد قوتوں کے قائل ہیں جو کل کائنات میں حکمراں ہیں۔ نیکی کی قوت کا نام "سپنتا مینو" یا خدا اور بدی کی قوت نام "انگرا مینولا" ہے۔

ان دونوں قواء کے افعال مختلفہ پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اس مذہب میں ثنویت کی بو آنے لگتی ہے۔ لیکن آج کل کے تعلیم یافتہ پارسی کہتے ہیں کہ اگرچہ کتاب مقدس میں ان دونوں قوتوں کے متضاد افعال کا ذکر ہے۔ لیکن یہ دونوں قوتیں در اصل ایک ہی خدا یعنی اھورا مزدا کے دو پہلو ہیں جیسا کہ اسلام میں خدائے یگانہ اپنے جلالی اور جمالی پہلو سے ظاہر ہوتا ہے۔ یا جیسا کہ اسلام میں خدا اور شیطان سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ مذہب اسلام کی رو سے شیطان خدا کا کیا ہوا ہے لیکن زردشت کے نظام میں اہرمن کی پیدائش کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

پیروانِ زردشت صحت۔ خوشی اور زندگی کو قوت نیکی سے منسوب کرتے ہیں اور موت بیماری وغیرہ کو قوت بدی سے۔ بنا برایں اس مذہب کا فلسفہ ثنویت پر مبنی ہے۔

ان کے فلسفہ اخلاق کی بنا اصول سہ گانہ یعنی پندار نیک اور کردار نیک پر ہے۔ نیز زردشتیوں کا مسلک ہے کہ انجام کار نیکی بدی پر غلبہ کرلے گی۔ اور بدی آگ میں جلکر پاک و صاف ہوجائیگی۔ اور مسرت خیز اور نامحدود زمانہ خودی کے معدوم ہونے کے بغیر اور اسرار خودی کے معرفت کے ساتھ خدا کی سلطنت میں آغاز ہوگا جس میں ہر انسان کو اس کے اعمال کے موافق ثواب اور عذاب ملیگا۔

پس زردشتیوں کے مذہب میں نیکی سے مراد دنیا کی آبادی اور دنیا والوں کی شادمانی میں کوشش کرنا ہے۔ ان کی تعلیم کا ماحصل تعلیم اور سوسائٹی کی خدمت ہے۔ یہ وجود حقیقی و مقدس کو تمام کائنات کا کارندہ سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ دنیا عالم روحانی کا پرتو ہے۔ بنابراں ہم کو چاہیئے کہ اس عالم مادی کی بہبودی اور بھلائی میں کوشاں رہیں۔ اس لئے اس مذہب میں گوشہ گیری و انزوا کو کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ معرفت نفس یعنے اپنے وجود میں خورشید الہٰی کے ایک نورانی ذرے سے واقفیت حاصل کرنا دوسروں کی خدمت کے لئے ضروری ہے۔ ان کے لئے کل اوصاف حمیدہ اور صفات جمیلہ وہ ہیں جن کی خدمت قوم کے لئے ضرورت ہے۔ مثلاً "اوشا" (تقوی) مجموعہ اوصاف ستودہ تصور کیا گیا ہے۔ جس کا ظہور راستی اور درستی میں ہوتا ہے

عدل۔ فیاضی۔ اطاعت۔ صلح۔ دوستی۔ خوش مزاجی الغرض وہ کل صفات جو سوسائٹی سے متعلق ہیں اس مذہب میں احسن متصور ہوتے ہیں۔ وِن دے داد ( VENDIDAD ) زردشتیوں کی دوسری کتاب ہے۔ .... زندگی اور اس کے فضائل پر بحث کی گئی ہے۔

اس مذہب میں دنیاداری پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ ہر قسم کے عیش وعشرت کو جو سوسائٹی کے امن میں خلل انداز نہ ہوں جائز تصور کیا گیا ہے۔ گوشہ گیری اور روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ یہ ایران کا قدیم ترین مذہب ہے۔ ہخامنشی خاندان بھی اسی مذہب کا پیرو تھا۔

سکندر کے حملے کے بعد سلیوکیہ خاندان کے زمانے میں اس مذہب کو قدرے زوال ہوا۔ لیکن جب اشکالی خاندان ( PARTHIAN KINGS ) برسرحکومت ہوا تو دوبارہ تمام آتش کدوں کو روشن کیا گیا۔ لیکن اس خاندان کی بے تعصبی کی وجہ سے مذہب عیسوی مغرب سے اور بدھ مذہب مشرق سے اس پر اثر ڈالنے لگے۔ اور ساسانیوں کے عہدحکومت میں اگرچہ بادشاہ اور اکثر اعیان دولت اس مذہب کی پُرزور حمایت کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس میں متعدد فرقے پیدا ہوگئے۔ زروانی۔ مانوی اور مزدکی۔ موخرالذکر دو فرقوں پر بودھ مذہب کا اس قدر اثر ہوا کہ یہ دنیا کو قوت بدی کی تخلیق سمجھنے لگے۔ بناءبرایں ترک دنیا اور گوشہ گیری کو خاص اہمیت دینی شروع کی

# فرقہ مانی اور مزدک

مانی کا عقیدہ ہے کہ کائنات نیکی اور بدی کے قواء سے مرکب ہے۔ اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ اس گرفتار شدہ قوت خیر کو قوت شر سے آزاد کرے۔ جس کے لئے لوازمات زندگی سے دوری لازمی ہے۔ قوت نیکی یا روح کو تقویت پہنچائی جائے۔ اور قوت شر یا جسم کو زائل کیا جائے۔ رہبانیت کے متعلق مزدک کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

لیکن یہ نیکی اور بدی کی متضاد قوتوں کے امتزاج کو عارضی اور غیر ارادی سمجھتا ہے۔ اور خلوت گزینی اور لذات دنیوی سے محترز رہنے کو خوبی تصور کرتا ہے۔ علاوہ بریں مزدکہ ایک طرح کی اشتراکیت (سوشیلزم) یعنے زر۔ زمین اور زن کی اشتراکیت کا طرف دار ہے ؎

# یونانیوں کا عقیدہ

دوسرا قدیم ترین مذہب یونانیوں کا ہے جو بنام مذہب

---

(1) ZORASTRIAN ETHICS BY JACKSON.

(2) THINKER OF IRAN BY PROF M.A SHUSTARY.

(3) ANCIENT PERSIA, & IRANIAN CIVILIZATION BY CLEEMENT HUART

(4) THE LIGHT OF PERSIA, BY MANECK PITHWALA.

عقلیت (RATIONALISM) موسوم ہے۔ یہ بھی بدھ مذہب کے مانند وجود الہٰی کا منکر ہے۔ ان کا فلسفہ اخلاق زیادہ تر اجتماعی ہے۔ اور ان کے فلسفہ اخلاق اور سیاست میں نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ ان کے لئے ہر فرد انسانی کو کسی سیاسی انجمن یا معاشرہ سے وابستہ ہونا چاہئے۔

ان کے فلسفہ کے تین دور ہیں (۱) دور طفولیت (BOYHOOD) (۲) دور رشد (MANHOOD) اور (۳) دور زوال۔

دور طفولیت میں علم مابعد الطبیعات کے مسائل زیر غور رہے۔ معرفت۔ حقیقت۔ اور کائنات فلسفہ دانوں کا نصب العین رہا۔ لیکن فیثاغورث (PHYTHOGORAS)۔ اور ہیراکلی ٹس (HERACLITUS) اور دیمقراطیس (DEMOCRITAS) بہ نسبت مذہب کے فلسفہ کی طرف زیادہ مائل تھی۔

---

(5) EARLY ZORASTRIAN BY MOULTON
(6) THE TEACHINGS OF ZORASTER BY S.A. KAPADIA.
(7) ZORASTRIAN ETHICS BY M.A. BUCH.
(8) THE TEACHINGS OF ZORASTER BY HOPE MOULTON
(9) اخلاق ایران باستان
(10) انسکلوپیڈیا بری ٹانیکا (زردشت)
(11) انسکلوپیڈیا آف مذہب و اخلاق از ہیسٹنگ

دور رشد میں سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کا ظہور ہوا
اور دور زوال میں فرقہ ابی قورنگ (EPICURIANISM)
اور فرقہ رواقیہ (STOICISM) پیدا ہوئے۔

سوفسطائی (SOPHISTS) فرقہ پانچ سو سال قبل مسیح
ظاہر ہوا۔ یہ فرقہ خود کو صاحب حکمت کے نام سے موسوم کرتا تھا
اور مذہبی عقائد و رسم کا منکر تھا۔ حکمت کے زور سے بذریعہ سوال
و جواب خلاف فریق کو لاجواب کر دینا ان کا آلہ کار تھا۔ اس
فرقے کے ظہور کے بعد یونان کا بہت بڑا فلاسفر سقراط ظاہر ہوا۔

**سقراط** کہا جاتا ہے کہ سقراط اپنے دل میں ایک صدائے
غیبی کو محسوس کرتا تھا۔ اور اس کی ذات میں بزرگی
اور دانشمندی مجتمع تھی۔ لیکن اس کا ضمیر صرف امور منکرہ کی
طرف اشارہ کرتا تھا۔ اگرچہ سقراط عادت پسند تھا لیکن گوشہ
گیری کو اصول اخلاق میں داخل کرنے سے محترز رہا۔ اس کا
عقیدہ تھا کہ نہ تو گوشہ گیری احسن ہے اور نہ آوارہ گردی
خوب۔ ہر چیز میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہئے اور اپنی ضروریات
کو محدود بنانا چاہئے۔

ایک بادشاہ عادل کے مقرر کردہ قوانین کی پیروی ضروری
ہے۔ سقراط کے بعد متعدد فرقے ظاہر ہوئے۔ (۱) مے گاریہ
(MEGAREANS) - (۲) سرینیہ (SYRENAICS) (۳) کلبیہ
(CYNICS) (۴) افلاطونیہ (PLATONICS) صرف مے
گاریوں کے فرقے میں مذہب کا رنگ نظر آتا ہے۔ فرقہ سرینیہ

کے لئے خوشی و مسرت قابل اعتنا نہیں۔ اس فرقہ کا اصول اخلاق بیشتر انفرادی۔ منفی اور بیرونی ہے۔ آگے چل کر رواقیہ نامی فرقہ ان کی پیروی کرتا ہے۔

**افلاطون** فلسفۂ افلاطون صوفیانِ اسلام کے نزدیک بعید مقبول رہا۔ الکندی۔ فارابی۔ ابوبکر رازی ابن الرشد علی بن رضوان نے قوانین کو بشرح و بسط لکھا ہے۔ صوفیائے کرام کا عقیدہ انھیں مثل ایک بزرگ ترین قوت کے افلاطون کے عقیدۂ تخیل نیکی یا ( IDEA OF GOOD ) کے بالکل مطابق ہے۔ جس کو وہ علم حسن اور راستی کا مصدر تصور کرتا ہے مسٹر راجو کے قول کے مطابق۔

"افلاطون بتوسط روح اس تخیل نیکی یعنی ( IDEA OF GOOD ) کی معرفت کو علم کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ روح میں اس تخیل کی اقامت کو فضیلت اور روح میں اس کی روشنی کو بنام جمال اور سلطنت میں اس کے ظہور کو بنام عدل ملقب کرتا ہے"۔

افلاطون اپنی مشہور تمثیل غار کے تحت میں کہتا ہے کہ ہم دنیا میں صرف ایک حقیقت غائبانہ کی ظاہری صورتوں کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ در اصل کل اشیائے مدرکہ حقائق کی ناقص مثالیں ہیں۔ اشیائے مدرکہ متعدد ہیں۔ جنکی ایک واحد حقیقت عالم معنی میں موجود ہے۔ پس ہمیں ان موجودات مادی و مدرکہ کو حقائق مجردات کے علم کے لئے وسیلہ بنانا چاہئے۔

افلاطون کا یہ عقیدہ مسلمانوں کے عقیدہ اعیان ثابتہ سے ملتا جلتا ہے۔ نیز افلاطون کا یہ عقیدہ مسلمانوں کے عقیدۂ اعیان ثابتہ سے ملتا جلتا ہے۔ نیز افلاطون صحت جسم کو صحتِ روح کی لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ چہارگانہ اصول اخلاق یعنے علم. شجاعت اعتدال اور عدل کی وضاحت کرکے صفتِ عدل کو تمام اوصاف محمودہ کا مجموعہ تصور کرتا ہے۔ نیز اس کا یہ عقیدہ ہے کہ روح انسانی اگرچہ عالم علوی سے متعلق ہے۔ لیکن دنیائے مادی کی پیوستگی کی وجہ سے اوصاف ذمیمہ اس سے صادر ہوجاتے ہیں۔ روح انسانی کے تین حصے ہیں۔ یعنے جزو عقلی۔ جزو حیوانی۔ جزو ہوس۔ ان میں سے جزو عقلی اور جزو ہوس متضاد ہیں۔ لیکن جزو حیوانی جس کی بناء غیض و غضب پر ہے عقل اور ہوس سے مرکب ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ جزو حیوانی اور جزو ہوس کو جزوِ عقل کے زیر حکم رکھے۔ افلاطون مولانا رومؒ کے مانند کہتا ہے۔ چونکہ روح خدا سے مربوط ہے اس لئے ہمیشہ مادیت سے نجات حاصل کرکے اپنے مبداء کے وصال کے لئے مضطرب ہے۔ افلاطون ہندوؤں کے فلسفۂ نجات شخصی کے مقابلے میں نجاتِ اجتماعی پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جو شخص حقائق علوی علوی سے آشنا ہوکر قربتِ الٰہی میں پرواز کرجاتے وہ معرفت کلی اور دیدار حقائق کے بعد اپنے ارادے اور اختیار سے اس عالم سفلی میں دوسروں کی اعانت کرے۔ افلاطون زندگی اجتماعی پر اتنا زور دیتا ہے

کہ افراد انسانی کی زندگی محض قومیت ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس جوشِ قومی میں اشتراک جائداد اور اہل و عیال (COMMUNITY OF PROPERTY & FAMILY LIFE) کو احسن سمجھتا ہے جس کی رو سے انسان کو اپنی شخصیت اور آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اگرچہ افلاطون کا فلسفہ عقلی کہلاتا ہے۔ لیکن اس کو تخیل نیکی (IDEA OF GOOD) کے نام سے ایک ایسی ہستی برحق پر ایمان لانا پڑتا ہے جو کل کائنات پر نگران ہے۔

**ارسطو**

ارسطو کی تعلیم بھی، افلاطون کی طرح سیاسی اور اور اس کا نصب العین افراد انسانی کی خوشی ہے۔ افلاطون کے عقاید نیکی پر اعتدال زریں کے عقیدے کا اضافہ کرکے کہتا ہے کہ ہر خصلت میں افراط و تفریط کے درمیان ایک فضیلت ہوتی ہے۔ یعنے شجاعت افراط کی صورت میں تہور کی طرح نظر آتی ہے۔ اور بزدلی اس کی تفریط ہے پس کسی خصلت میں بھی افراط و تفریط ٹھیک نہیں۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کو جلال الدین دوانی اپنی کتاب "اخلاقِ جلالی" میں بوضاحت تمام بیان کرتے ہیں کہ برائیوں کے راستے متعدد ہیں اور نیکی کا راستہ واحد اور مشکل تر ہے۔ جو مذہبی زبان میں "صراط المستقیم" کے نام سے موسوم ہے۔ اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چلنے کے لئے ہم سورۂ فاتحہ میں کہتے ہیں۔ "اھدنا الصراط المستقیم" یعنے اے خدا اس راہ راست

پر چلنے کی ہدایت فرما۔ مسلمان تو اس راستے کی رہبری کے لئے خدا سے ملتجی ہیں۔ اور ارسطو کہتا ہے کہ یہ وہ راہِ اعتدال ہے جو ایک صاحبِ حکمت کی مقرر کی ہوئی ہے۔ پس اسی اعتدال کے اصول زریں کی رو سے ارسطو نہ تو خلوت گزیں کو قابلِ ستائش سمجھتا ہے اور نہ لذاتِ دنیوی میں غرق ہونے کو۔ یہی ارسطو کا قانون اخلاق ہے۔

مسلمانوں میں ابن الرشد نے اس کی پیروی کی۔ دراصل اس کا قانون اعتدال مسلمانوں کے اصول اخلاق کا مرکز ہے اکثر مسلمان حکماء نے ارسطو کے فلسفے کی مخالفت کی۔ دراصل افلاطون اور ارسطو کا زمانہ فلسفۂ یونان کا عالمِ شباب تھا۔ ان کے بعد دورِ زوال شروع ہوتا ہے۔ دورِ زوال میں فرقہ رواقیہ (STOICS) کا ظہور ہوا۔ جس کا بانی زینو (ZINO) تھا۔ اس فرقہ میں قوانینِ فطرت کی پیروی کو جو ایک صاحبِ حکمت سمجھ سکے احسن قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ قوانینِ قدرت کی پیروی قوانینِ الٰہی کی پیروی کی قابلیت بخشتی ہے۔

دوسرا طائفہ (EPICURIAN SCHOOL OF PHILOSOPHY) ابیقوریہ ہے۔ جس کے لئے زندگی کا مقصد خوشی اور عیش و عشرت وہ تمام لذاتِ دنیوی جو اطمینانِ خاطر کا ذریعہ ہوں بہترین ہیں۔ جس طرح کہ فرقۂ رواقیہ کا اثر یہودیوں اور عیسائیوں پر ہوا مِل کا قانون لذت ابیقوریوں کے عقائد سے متاثر ہوا۔

# فرقۂ نو افلاطونیت

فرقۂ افلاطونیت جدید در اصل آئین افلاطون کی ایک شاخ ہے۔ لیکن اس کا نظریہ مثل (IDEAL) جدا ہے۔
پلوٹینس نے (POLOTINUS) جو اس عقیدہ کا موجد ہے۔ آئین خلوت گیری کو مشرق سے لیا ہے اور اشیائے غیر مرئی کے تصور کو مشرق کے وحدانیت خدا کے عقیدہ سے ملایا ہے۔ پیروان نو افلاطونیت صوفیان اسلام کے مانند معتقد ہیں۔ کہ تمام اشیا خدا کی طرف سے عالم وجود میں آئی ہیں اور اور جب یہ اپنے مبداء کی طرف رجعت کرینگی۔ ان کا مقصد حیات حاصل ہو جائیگا۔ مسلمانوں کے عقیدۂ النفس و آفاق پر غور و فکر کے مطابق یہ نفس کے مشاہدہ اور تفکر کو شریف ترین خصلت قرار دیتے ہیں۔ خلوت گزینی اور لذات دنیوی سے دوری کو نیک سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسان تصور اور فکر کے ذریعہ خودی کے حدود سے باہر آکر ایک اعلیٰ ترین خودی میں اپنے محبوب کے جمال کو مشاہدہ کرسکتا ہے۔ اور یہ روحانی وصال شادمانی اور سعادت جاودانی کا باعث ہوتا ہے۔ انسان اپنی عقل جزوی کی وجہ سے عقل کلی سے مربوط ہے۔ جسکی معرفت اپنی یکتائی اور وحدانیت کے اعتبار سے عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے۔ —
پلوٹینس انسانوں کی تین قسمیں قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ قرآن

مجید میں بھی مذکور ہے[1]

"وہ جو صفائی روح کی طرف مائل ہیں۔ دوسرے وہ جو تاریکی میں غرق ہیں اور آخر میں وہ لوگ جو کامل ہو چکے ہیں"

پلوطینس کا شاگرد پروفیری (PROPHYRY) خلوت گزینی کا قائل ہے اور این بی کس (IANBICHUS) نے جو پروفیری کا شاگرد ہے نو افلاطونیوں کے رہے سہے فلسفہ کو بھی مذہب کے رنگ میں تبدیل کر دیا۔ پس نو افلاطونیوں کا اہم ترین عقیدہ قربت الٰہی ہے جسکی رو سے یونانیوں کے مخصوص مذہب عقلی کو نقصان پہنچا۔

**مذہب یہود** یہودیوں کے عقاید زرتشتیوں کے عقائد سے ملتے جلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بنی

---

(۱) OUTLINE OF ISLAMIC CULTUR BY M.A SHUSTERY

(۲) A CRITICAL HISTORY OF GREEK PHILOSO-PHY BY W. T. STACE

(۳) REPUBLIC BY PLATO VOLUME I & II

(۴) NEETLESHIPS' LECTURES OF PLATO'S REPUBLIC

(۵) A SHORT HISTORY OFETHICS BY ROGERS.

(۶) LECTURES BY MR. SRINVSAYANGAR M.A ASST. PROF. OF PHILOSOPHY IN B.A CLASS OF 1935-36, IN THE MAHARAJA'S COLLEGE MYSORE

(۷) LECTURES ON COMPARATIVE RELIGION BY MACDONELL.

اسرائیل اپنی اقامت بابل کی وجہ اور جانشینوں ACHEMA (NIANS- کے زیر حکومت رہنے کے باعث زرتشتیوں کے متعدد عقائد اختیار کر چکے تھے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ایسی قوت ہے جس سے وقوع بدی ناممکن ہے۔ انسان اور خدائے واحد کے درمیان حد فاصل ہے۔ پس ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ نجات شخصی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ گو کہ اہل خدائے واحد تک پہنچنا بندہ کے لیئے ناممکن ہے۔ تاہم قانون الہی کی اطاعت اور رضا برضائے الہی بہترین اوصاف ہیں۔

**مذہب عیسوی** مذہب عیسوی میں تصوف کی ابتدا حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں ہی ہوئی۔ حضرت عیسےٰ اور انکے حواری اپنی زندگی ذکر الہی اور پاکیزگی اطوار کے لئے وقف کر چکے تھے اور ماسوا اللہ ان کی نظروں میں ہیچ تھا۔ عیسائیوں کے لئے حضرت عیسےٰ کی زندگی و زہد نمونہ عمل رہے۔ پس عیسائیوں نے گوشہ گیری اور عزلت کو ذریعہ نجات سمجھا۔ حضرت عیسےٰ کا قول ہے بہشت دولت مندوں کے لیئے نہیں ہے۔ سینٹ آگسٹین کے عقیدے میں انسان فطرتاً "بد ہے" اس وجہ سے زمانۂ وسطیٰ میں اس مذہب کے پیرو دنیا سے احتراز کرنے کی تعلیم دیتے رہے۔ اور عقیدۂ رہبانیت عیسائیوں کی نظروں میں اس درجہ مقبول ہوا کہ ان کا ایک طبقہ جس میں کہ عورت اور مرد شامل جدا کرتے تھے۔ عوام سے علیحدہ زندگی بسر کرنے لگا۔ جن کا کام صرف ذکر الہی اور

گوشہ گیری تھا۔ اور اس پر اس شد و مد سے عمل کیا جانے لگا کہ ازدواجی زندگی اور علائق دنیاوی سے یہ جماعت علیحدہ رہنے لگی۔ (عله)

## مذہب اسلام میں عقیدہ تصوف کا نشو و نما

اسی ماحول میں اسلام کا ظہور ہوا۔ اس نے رہبانیت کی سختی کو کم کرنے کے لئے "لا رھبانیت فی الاسلام" کا نعرہ لگاکر یہ ثابت کیا کہ اس مذہب میں تصوف اور ازدواجی زندگی اور ادائے فرائض دنیاوی میں تضاد نہیں اسلام میں تصوف کے معنی صفائے قلب۔ پاکیزگی اطوار اور لذائذ دنیوی اور خواہشات کا موقع و محل کے مطابق استعمال اور قوائے فطرت کی تعلیم و تربیت ہے۔ ان خواہشات کو جو مقتضائے فطرت انسانی ہیں تباہ کرنے کے بجائے اعتدال پر رکھنا چاہیئے انسان اس دنیا میں رہے سہے اور لذائذ دنیوی سے ایک حد تک محظوظ بھی ہو۔ لیکن یہ سب صرف اس حد تک جائز ہے کہ اس کی روحانی ترقی میں یہ اشیاء مخل انداز نہ ہوں۔ صحت جسمانی کا خیال رکھا جائے۔ کیونکہ تندرست جسم صحت روح کی ادنیٰ شرط ہے اور روح مطمئنہ ایک تندرست جسم میں خوشی سے

---

(عله) LECTURES ON COMPARATIVE RELIGIONS BY M. MACDONELL.

ممکن ہوتی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ رسول صلعم کی محبوب چیزوں میں صنف نازک کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ازدواجی زندگی زہد و تقویٰ کے متضاد نہیں۔ صوفیائے کرام کا جو وجدانی عقیدہ ہے اس کی رو سے وہ مذہب کو فلسفہ سے نکال کر علم لدنی یا کشفی کے حدود میں لے جاتے ہیں اور اسے علم اکمل شمار کرتے ہیں۔ لیکن فلسفہ اور دنیاوی علم کو بھی پس پشت نہیں ڈالتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ انسان عقلی علوم کی تحصیل کے بعد عالم علوی کے علوم کی طرف جو کشف اور عنایت الٰہی پر مبنی ہیں پرواز کرے۔ اس پہلو کو ہم سر اقبال کے خیالات کے نشو و نما میں بخوبی ملاحظہ کرتے ہیں۔ سر اقبال نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ علوم مغربی سے آشنا تھے۔ اس کے باوجود آپ کا قلب بے چین رہا۔ وہ ایک ہستی مطلق کی تلاش میں بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اور آخر میں وہ ایک واقف اسرار کی طرح مطمئن نظر آتے ہیں۔ متصوفین کے لئے قلب عقل سے بڑھ کر ہے۔ فلسفہ کی بنیاد صرف قیاس اور شک و شبہ پر ہے۔ لیکن صوفی اس دنیائے شک سے گذر کر دل کی مشعل ہدایت کے ذریعہ سکون قلبی پاتا ہے۔

نیز تصوف اسلامی کی بنیاد قرآن و حدیث ہے۔ سنت نبوی کی پیروی پر زور دیا گیا ہے جیسا کہ سر اقبال رموز بے خودی کے آخر میں" عرض حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین "کے تحت

کہتے ہیں۔

"اے رسولؐ پاک میرے خیالات کی بناء اگر سوائے قرآن مجید کے کسی غیر شے پہ ہو تو روز محشر مجھ کو خوار کیجیو۔ اور اپنے قدموں کے بوسے سے مجھے محروم رکھیو۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کے فلسفہ تصوف کا ماخذ قرآن و احادیث ہیں جن کو وہ شاعری کے نغمے میں پیش کر رہے ہیں۔

شیخ ابوالحسن حواری سے منقول ہے

"اتباع سنتِ نبویؐ سے باہر ہو کر جو بھی عمل کیا جائے باطل ہو گا۔ (رسالۂ قشیریہ)

حضرت جنیدؒ بغدادی کا قول ہے۔

"جو شخص حافظ کلامِ الٰہی اور عالمِ احادیثِ رسولؐ نہیں اس کی تقلید طریقت کے متعلق درست نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم کا ماخذ قرآن و حدیث ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک خدا کا ظہور انسانی شکل میں ناممکن ہے۔ ہاں بندہ کی پرواز خدا کی طرف ہو سکتی ہے۔ ہندو مذہب کی رو سے خدا پیکر انسانی میں کبھی بعض وقت حلول کر سکتا ہے۔ نیز اس مذہب میں تسکین اور طمانیت روح و قلب اور دنیا سے علیحدگی کو احسن قرار دیا گیا ہے۔

لیکن صوفیائے کرام اضطراب۔ رقت۔ شوق اور بے چینی
میں مسرت بے اندازہ محسوس کرتے ہیں۔ صوفیائے کرام
کے نزدیک فنا کے معنی شکر کے پانی میں گھل جانے کے
نہیں ہیں۔ بلکہ لوہے کا اس قدر گرم ہوجانا ہے کہ وہ سرخ
ہوکر آتش کی طرح کل صفات آتش سے مزین ہوجائے۔
با ایں ہمہ اس کی خصوصیت یعنی آہنیت باقی رہے۔

مسلمان فنا فی اللہ اور دنیا کی طرف باز گشت کے بعد
سیر باللہ کا بھی قائل ہے۔ جس کی رو سے سالک کو درجہ تکمیل پر
پہنچنے کے بعد دوسروں کی رہبری اور مدد کے لئے اس درجہ
اتر آنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اس درجہ میں کل قوانین
شریعت کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ پس اسلامی تصوف دوسری
نیکیوں کی طرح اعتدال پر مبنی ہے۔ اس میں نہ تو بندۂ
ہوس ہونا جائز ہے اور نہ رہبانیت کو جگہ دی گئی ہے
متصوفین کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے گلستاں سے ہوا و ہوس
کے کانٹوں سے دامن کو بچاتے ہوئے گزر جانا چاہئے۔

عقیدہ الہی کے متعلق بعض صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ
خدا کے سوائے کوئی دوسری چیز حقیقی نہیں۔ بندہ اس حقیقت
کا عکس یا سایہ ہے۔ بعض متصوفین اسلام کا عقیدہ ہے کہ ایک
وجود مطلق کل کائنات پر حاوی و ساری ہے اور یہ عالم نظری
سراب محض ہے۔ بعضوں کا مسلک ہے کہ کائنات سراب
نہیں ہیں بلکہ حقیقت کا ایک پہلو ہے۔ انسان میں صفات

الٰہی کمتر و ناقص صورت میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ اور خدا ہی حسنِ ابدی اور شایانِ محبت ہے۔ کل قوانینِ عالم حسن اور محبت پر مبنی ہیں۔ عشق وصالِ الٰہی کا یقینی اور نزدیک ترین راستہ ہے جس کے وسیلے سے انسان جو عاشقِ ذاتِ الٰہی اور اپنی ذات میں ناقص ہے۔ خود کو معشوقِ کامل تک پہنچا سکتا ہے۔ علم کے ذریعے حقیقتِ حسن سے آگاہی ممکن ہے۔ پس انسان کو اس ذاتِ حقیقی کے تصور اور مشاہدے میں خوش رہنا اور ذکرِ الٰہی سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ اعمالِ صالح اس کے لئے باعثِ مسرت ہونگے۔ رنج و خوشی میں تسلیم کو شیوہ بنائے اور قوانینِ فطرت کے موافق جو خدائے وحدہٗ کی حکمت سے مترتب و منظم ہیں۔ زندگی بسر کرے اور مرضئِ الٰہی اور اس کی خواہش میں کہی قسم کا فرق نہ رہے یہاں تک کہ:-

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

نیز صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ جسمانی قلب اور روحِ حیوانی کے علاوہ ایک قلب روحانی ہے جس میں ارادہ کلّیہ منعکس ہوتا ہے۔ یہ قلب علمِ حقیقی سے منور ہو کر انسان کو معراجِ کمال پر پہنچاتا ہے۔ انسان فطرتاً نیک ہے اور اس کی روح مادیت سے مبرّا اور مکان و زمان کی قید سے آزاد اور روحِ کل سے مربوط ہے۔ روحِ کل سورج اور روحِ جزوی اس کی کرنیں ہیں۔ روحِ جزوی جسمِ انسان میں ذکر اپنے مرکز کی

ربط کی وجہ سے نالاں اور مضطرب نظر آتی ہے۔ مادیت کے ساتھ پیوستگی کی وجہ سے اس سے برائی کا ظہور ہوتا ہے۔ روح کی ترقی یا زوال اعمال انسانی پر منحصر ہے۔ پس زندگی موجودہ کو آئندہ روحانی زندگی کی ابدی مسرتوں کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ دوزخ اور جنّت در اصل اپنے محبوب سے قربت یا دور افتادگی ہیں۔

پس صوفیائے کرام افلاطون کے خیال کے مطابق حقیقت کو یعنی افلاطونی تخیل نیکی (IDEA OF GOOD) کو ارادہ کلی۔ علم صحیح۔ روشنی جاوید اور مکمل حسن تصور کرتے ہیں جو کائنات میں ظاہر ہو رہا ہے۔

صوفیائے کرام کہتے ہیں انسان کی فطرت میں نفس حیوانی۔ نفس عقلی اور نفس روحانی داخل ہیں جن کی کمی بیشی سے انسان نیک یا بد ہو سکتا ہے۔ سالک کا اولین فرض مرشد کامل کا انتخاب ہے۔ روحانی تربیت کے تین درجے ہیں۔ (٭)

پہلا شریعت کا درجہ ہے۔ جس میں کل احکام شرعی کی پابندی لازمی ہے۔ اس درجے کی دوسری منزل طریقت ہے۔ جس میں پیر کی اطاعت یہاں تک ضروری ہے کہ سالک کو فنا فی الشیخ ہو جانا چاہیئے۔ معرفت کے درجہ

(٭) OUTLINE OF ISLAMIC CULTURE VOL II BY PROF. M.A. SHUSHTERY.

معرفت کے درجے میں سالک کا دل و دماغ علم الٰہی سے منوّر ہو جاتا ہے۔ تیسرے درجہ حقیقت میں سالک حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے اور یہ وصال حقیقت عنایت الٰہی اور تزکیہ نفس کے ذریعہ ممکن ہے۔ تحقیق۔ تفتیش۔ فلسفیانہ روشنی کے ذریعہ انسان حقائق سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ محبت۔ نیکی۔ توجہ۔ توکل اخلاص۔ توبہ۔ تسلیم۔ تو(کشادہ نظری)۔ کشف اور لذائذ دنیوی سے کنارہ کشی اس کو فنا فی اللہ کے درجے تک پہنچا سکتے ہیں جو مقصد حیات ہے۔

**اسلامی تصوف کے سلسلے** اسلام میں تصوف کے متعدد سلسلے ہیں جن میں سے نقشبندیہ طریقہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اور باقی سلسلے حضرت علیؓ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ سلسلۂ قادریہ کے بانی حضرت عبدالقادر گیلانی ہیں۔ باقی سلسلوں میں شطاریہ طریقہ قابل ذکر ہے۔ پروفیسر ایم اے شوشتری اپنی تصنیف OUTLINE OF ISLAMIC CULTURE میں لکھتے ہیں کہ اس سلسلے کے چیدہ عقائد سر اقبال سے ملتے جلتے ہیں۔ اس سلسلے کا عقیدہ ہے کہ خودی کو ترک کرنے کے بجائے اس کو تقویت دینی چاہیئے۔ انسان بجز اس کے کہ "میں ہوں" کچھ اور نہ کہے۔ ریاضت اور نفس کشی کی ضرورت نہیں اور نہ فنا کے کوئی معنے ہیں۔ جس سے ثنویت کا جو آتی ہے وقعت اور تفکر تضیع اوقات ہیں۔ روح نیوانی وصال الٰہی میں سدراہ نہیں ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی خودی اور اپنے

صفات اور افعال کو خدا کی خودی کے مطابق بنائے۔

صوفیائے کرام کی تاریخ تین عہدوں میں منقسم کی جاتی ہے:-

۱۔ عزلت اور ریاضت کی زندگی۔
۲۔ علوم عقلی کی ترویج و ترقی یعنے تصوف پر فلسفہ کا اثر
۳۔ دورۂ زوال۔

عہد اولین پیغمبر صلعم سے شروع ہو کر عباسیہ خاندان کی ابتدا پر ختم ہوتا ہے۔ خلفائے راشدین اور بعض اصحاب پیغمبر اپنے زہد و تقوی اور جوش مذہبی میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ بعض مسلمان انتہائی غربت کی وجہ سے مسجد میں رہتے تھے۔ حضرت علیؓ اپنے زہد و تقوی اور فلسفیانہ خیالات کی وجہ بہ نظر احترام دیکھے جاتے تھے۔ تقریباً تمام سلسلوں کے پیرو ان کو اپنا روحانی استاد اور رہبر سمجھتے ہیں اویس قرنی۔ ابوذر غفاری۔ مالک بن حارث۔ کمال بن زیاد سری سقطی۔ معروف کرخی ان کے پیرو تھے۔ عہد اولین کے صوفیائے کرام ایران کے رہنے والے تھے۔ شام اور مصر کے باشندوں میں سے لیکن ان کی تعلیمات قوانین شرع و احادیث پر مبنی تھیں۔ حبیب عجمی۔ ابراہیم ادہم۔ فضیل بن ریاض۔ احمد بلخی۔ حاتم اصم۔ ابو حسین نوری خراسانی۔ یحیے بن معاذ بایزید بسطامی۔ سہیل بن عبداللہ جنید بغدادی۔ ابوبکر شبلی خراسانی ایران کے مشہور صوفی ہیں۔ ابراہیم ادہم بلخ کے شاہزادوں میں سے تھے۔ اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر زہد و ریاضت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ کہا کرتے تھے کہ

"اپنے نفس پر غلبہ پانا سلطنت پر حکومت کرنے سے بہتر ہے۔"

فضل بن ایاض کا فرمان تھا:۔

"خلوت گزینی میں امن ہے"

احمد بلخی کہا کرتے تھے:۔

"اپنی روح (حیوانی) کو مارو تاکہ اس کو حیات تازہ میسر ہو سکے۔ خدا تو صاف طور سے دکھائی دیتا ہے، لیکن تم اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے کہ تم اندھے ہو"

ابوحسن نوری کا عقیدہ تھا کہ:۔

"میں نور خدا کو دیر تک ملاحظہ کرتا رہا۔ تاآں کہ میں خود بھی نور مجرد بن گیا۔ صوفی وہ ہیں جنکی روح تمام گندگیوں سے پاک ہو صوفی نہ تو دولت دنیوی کا مالک ہوتا ہے اور نہ اس کا غلام، وہ نہ کسی چیز سے وابستہ ہے اور نہ کوئی شئے اس سے وابستہ ہے۔ تصوف نہ تو رسوم مذہبی کی پابندی ہے اور نہ سائنس اور فلسفہ کا علم۔ اس کے معنی اخلاق کا کمال۔ پاکیزگی۔ آزادی۔ شجاعت دنیاوی خواہشات سے کنارہ کشی اور فیاضی ہے۔ تصوف کے معنی دنیا سے دشمنی اور خدا سے دوستی ہے۔

یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں:۔

زاہد تو صرف اس عالم سفلی کے لذائذ سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ لیکن صوفی عالم دیگر کے لذات سے بھی مستغنی ہو جاتا ہے۔ صوفی کو بہشت کی بھی تمنا نہیں ہوتی۔ وہ شخص جو اپنے محبوب کے سوا دوسری شئی کو بھی دیکھتا ہے اپنے محبوب کے دیدار سے محروم رہتا ہے۔ سچی محبت معشوق کے ظلم اور مہربانی سے کم وبیش

نہیں ہو سکتی ۔

بایزید بسطامیؒ کا قول ہے :۔

میں اپنے لباس میں خدا کے سوا کسی شے کو دیکھ نہیں سکتا ۔ میں خود ہی ساقی شراب اور رند ہوں ۔ میں خدا کے نزدیک حاضر رہتا ہوں ۔ یہاں تک کہ ایک دن میں نے اپنے اندرون قلب سے اس آواز کو سن لیا "اے تو ۔ میں"

تصوف کے معنی راحت و آرام سے کنارہ کش ہو کر رنج و آلام سے قبول کرنا ہے ۔ نیز کہا کرتے تھے :۔

میرے مرید در اصل وہ ہیں جو قیامت میں دوزخ کے کنارے پر گنہگاروں کو وہاں سے نکالنے کے لئے کھڑے ہونگے ۔ اگر ضرورت ہو تو انکی نجات کے لئے جہنم میں داخل ہونے سے بھی دریغ نہ کریں گے"

نیز بایزیدؒ سے منقول ہے :۔

" میں نے ایک دن ایک آواز سنی جس نے مجھے اپنے خزانے میں جو لوگوں کی محبت اور ذوق سے پُر تھا ۔ ایک شے لانے کا حکم دیا ۔ میں نے پوچھا کیا چیز لاؤں ۔ ندا آئی ۔ عجز، توبہ اور معذرت کو لاؤ ۔

جنیدؒ بغدادی کا قول ہے :۔

" عقل میں جنونیت کو غرق کر دینے کے بجائے بہتر ہے کہ جنونیت میں عقل کو ڈبا دیا جائے ۔ تصوف کے معنی ماسوائے اللہ سے علیحدگی اور اس کا مقصد فنا فی اللہ اور بقاء باللہ ہے ۔

صوفی کا باطن خدا اور اس کا ظاہر انسان ہے "

ابوبکر شبلیؒ کا قول ہے :۔

"سچی آزادی ماسوی اللہ سے قلب کی آزادی ہے۔ صوفی
کو دنیا میں اس طرح رہنا چاہئے گویا کہ یہاں پیدا ہی نہیں ہوا
ہے۔ حیات انسانی کو حقیقی سمجھنے سے احتراز لازمی ہے اور دائمی
اور اخوت باہمی قابل ستائش ہیں۔

حسن بصری عرب النسل تھے اور ان کا عقیدہ تھا:-
"نیک اعمال بہشت کی خواہش نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی
کے لئے ہونا چاہئے۔"

رابعہ بصری کا قول تھا:-
"اے خدا اگر دوزخ کے خوف سے میں تیری اطاعت کرتی
ہوں تو مجھے دوزخ کی آگ میں ڈال دے۔ اگر بہشت کی امید پہ
اطاعت کرتی ہوں تو وہاں مجھے داخل ہونے کی اجازت نہ دے
بار الٰہ اگر صرف تیرے لئے تیری فرماں بردار ہوں تو مجھے اپنے
دیدار سے محروم نہ کیجیو۔"

کتاب اللمع تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ جس کے
مصنف شیخ ابو النصر سراج الملقب بہ طاؤس الفقراء ہیں فرماتے تھے
"عشق اس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینے میں
جلتی رہتی ہے" اور ماسوی اللہ کے وجود کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے

دراصل آپ نے عقائد تصوف کو قرآن مجید اور احادیث
پر مبنی کیا ہے۔ منصور الحلاج قدیم ترین صوفی تھے۔ انھوں نے
فلسفہ کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ آپ نے انا الحق کا نعرہ بلند کیا۔
یعنی یہ کہ ہم خدا ہیں۔ لہٰذا ان کا عقیدہ تھا کہ روح انسانی اور
خدا کے درمیان اتحاد حقیقی موجود ہے اور افعال انسانی عبادات

سے افضل ہیں، اعمال چونکہ حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ اُن کا درجہ عبادات سے بڑھ کر ہے جن کا تعلق خالق و مخلوق کے درمیان ہے۔ یہی عقیدہ اقبال ہے جس کو اقبال "عمل پیہم" سے نامزد کرتے ہیں۔ مولویوں اور ملاؤں کے برخلاف صوفیائے کرام تزکیہ قلب کو عبادات ظاہری سے بہتر سمجھتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر گیلانی شہرت اور مقبولیت میں بے نظیر ہیں آپ کا زمانہ قدما کا آخر زمانہ تھا۔ مومن کے لئے احکام الہٰی کی تعمیل منہیات سے گریز اور تسلیم و رضا کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اتباع سنت اور ترک بدعت پر اُن کی تنبیہ، فتوح الغیب میں ایک مستقل باب ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ تصوف آٹھ خصائل پر مبنی ہے۔ جس کا مظہر ہر ایک نبی میں پایا جاتا ہے۔

(۱) سخاوت ابراہیم میں۔ (۲) رضا اسحاق میں (۳) صبر ایوب میں (۴) مناجات ذکریا میں (۵) غربت یحییٰ میں (۶) خرقہ پوشی موسےٰ میں (۷) سیاحت یا تجرد عیسےٰ میں (۸) فقر پیغمبر صلعم میں

شیخ شہاب الدین سہروردی تصفیہ قلوب اور تزکیہ نفس کو تعلیمات نبوی کا ثمرہ تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شریعت۔ طریقت کی پہلی سیڑھی ہے، یعنے تصوف نام ہے قولاً و فعلاً رسول صلعم کے اتباع کا۔ پس فرمان ہے کہ متابعت رسول صلعم محبتِ الہٰی کی علامت ہے جیسا کہ وعدۂ خداوندی ہے

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

یعنی اگر خدا سے محبت کرتے ہو تو میری متابعت کرو۔ خدا تم

سے محبت کرنے لگے گا۔ شیخ علی بن عثمان ہجویری جو ہندوستان میں داتا گنج بخش کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا مزار مبارک لاہور میں ہے اور اپنی تصنیف کشف المحجوب میں اس عقیدہ کا اظہار فرماتے ہیں کہ علم صحیح علم شریعت اور علم لدنی کا مجموعہ ہے صوفی وہ ہے جس کا قلب پاک وصاف ہو۔ اصل تصوف کی تین اقسام ہیں۔ اول وہ صوفی جو فانی ہو کر خدا میں باقی رہتا ہے دوم وہ متصوف جو کوشش وعمل سے اس درجہ کا طلب گار ہوتا ہے۔ سوم وہ صوفی ہے جو مال ومنال اور جاہ وثروت کی تحصیل کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ خود کو صوفیوں کے مانند ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ریاکار اور بندۂ ہوس اور حقیقت سے دور ہوتا ہے۔

دوسرے عہد میں جس میں فلسفیانہ خیالات۔ اور علم الکلام کا دور دورہ رہا۔ مذہبیت میں فلسفہ کا رنگ نظر آنے لگا۔ اس قسم کا فلسفیانہ تصوف کا زمانہ گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں اور چودہویں صدی کا ہے۔ حجت الاسلام امام غزالی ۱۰۹۲ء میں تولد ہوئے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اعمال وایمان ہر دو اہم ہیں۔ نجات کے لئے صرف نیت بغیر افعال کے کافی نہیں ہے۔ علم کشفی علم عقلی سے بالاتر ہے۔

امام صاحب خدا کو ایک اعلیٰ ترین اور بزرگ ترین ہستی قرار دے کر اس امر پر کل عقاید کی بناء رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں روح انسانی مجرد ہے۔ خدا نے اپنی روح کلی کا ایک جزو لیکر جسم انسان میں پوشیدہ کر رکھا ہے اور اس روح جزوی کا

وصال روح کلی کے ساتھ وصال یا روح کی رخصت اپنے مبداء کی طرف تکمیل انسانیت ہے۔ علوم عقلی کی غرض و غایت علم لدنی کی آفرینش ہے۔ جسم انسانی میں ایک جسمانی قلب بھی ہے جو ارادہ قدرت اور علم کی صفات سے متصف ہے۔ اور یہ صفات نفس انسانی کی معرفت سے ظاہر ہوتی ہیں۔ عقل و علم کی وجہ سے انسان اور حیوان میں تمیز ہوتی ہے۔

پس چاہیے کہ عقل خواہشات حیوانی پر حکمراں ہو لیکن جاننا چاہیئے کہ یہ علم لدنی کے مقابلہ میں پست تر ہے۔ نیز انسان اپنے ارادے میں نہ مختار ہے اور نہ مجبور مطلق۔ امام صاحب کی مشہور تصانیف احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت ہیں۔ احیاء العلوم چار جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ پہلی جلد میں وظائف مذہبی پر بحث کی گئی ہے۔ اور دوسری جلد میں زندگی و اجتماعی و سیاسی کو وضاحت بیان کرتے ہیں۔ جلد سوم زہد و گوشہ و گیری سے متعلق۔ چوتھی جلد میں روح کی اپنے مبداء کی طرف واپسی کی کیفیت بیان کی ہے۔

امام صاحب خوف خدا، صبر و شکر، توکل اور عشق۔ وصال الہی کو روح کی پاکیزگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور افلاطون کے مانند فضائل چہار گانہ جیسے علم۔ شجاعت۔ اعتدال اور عدل کے زیر بحث نیکی کی افراط و تفریط کو بدی قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انسان کی رہبری کے لئے استاد کامل کی ضرورت ہے۔ لیکن انسان کا فرض اولین ہے کہ پیغمبر صلعم کی پیروی اخلاق کو اپنا نصب العین قرار دے کر ان کے مانند شجاعت، عدل

اعتدال ۔ فیاضی ۔ پارسائی ۔ حیا ۔ وقار ۔ کشادہ نظری، راستی سادگی ۔ مہربانی اور شائستگی کو اپنا شعار بنائے ۔ اور صفاتِ الٰہی کی تقلید کرے ۔

فریدالدین عطارؒ کی تصنیف منطق الطیر تصوف کی بے نظیر کتاب ہے ۔ مولانا رومیؒ کی مشہور مثنوی کا نقشِ اول یہی مثنوی ہے اختصار افسانہ انسانوں کی بجائے چند پرندے تجویز کیے گئے ہیں جن کے سوال و جواب بجائے خود معرفت و عرفان کے دقایق ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔ معرفتِ الٰہی کی صورت یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو اس ہستیِ مطلق میں گم کر دے ۔

تو مباش اصلا کمال این است و بس
تو درو گم شو وصال این است و بس

ارشاد ہے کہ جب تک تم خود کو یعنی اپنے جسم و روح کو فراموش نہ کرو اس چیز سے آگاہ نہیں ہو سکتے جو سب کا موجب ہے ۔ آپ کا کہنا ہے کہ جتنے پرندے ہیں سبھی صفاتی نسبت ہو تو ایک ولی کامل کا درجہ ملیگا ۔ اتباعِ احکامِ الٰہی کا رتبہ سب سے اونچا ہے ۔ بہ حیثیت بندہ ہونے کے انسان کا کمال بندگی میں کامل ہونا ہے ۔ لیکن فطرتِ انسانی میں انوارِ الٰہی کی ایک شعاع مضمر ہے ۔ اور اس میں ایک مخفی خزانہ ہے اس لیئے خود کو کم نہ سمجھنا چاہیئے ۔

جلال الدین رومیؒ ایران کے بزرگ ترین شاعر اور صوفیائے کرام کے عقاید کے بہترین نمائندے تھے ۔ ان کی مثنوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اصل بہ زبانِ پہلوی میں قرآن ہے ۔

نو افلاطونیت کی طرح وہ روح انسانی کو اپنے مبداء کی طرف واپسی کے لئے آہ وزاری کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ عشق کو اعلیٰ ترین فضیلت قرار دیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ روح کو جذبات حیوانی پر حکمراں ہونا چاہیئے خواہشات کو تباہ کرنے کے بجائے ان کو پاک تر۔ لطیف تر اور منظم تر بنانا چاہیئے۔ افعال انسانی جو خدا کے ارادے کے موافق ہوں ہمیشہ نیک ہوتے ہیں۔ لیکن جن افعال میں انفرادی ارادے کا نفوذ ہوتا ہے۔ ممکن ہے نیک۔ یا بد ہوں انسان کی رہبری مرشد کامل کے ذریعہ ممکن ہے۔ ارادہ انسانی ارادہ الہٰی کے تابع ہونا چاہیئے۔ اعتماد یا توکل سے مراد کسالت نہیں جد وجہد۔ کوشش و سعی کے بعد ارادۂ الہٰی کے آگے سر تسلیم کو خم کر دینا چاہیئے۔ کہنا چاہیئے :- ؎

عاشقم بر رنج خویش و دردِ خویش
بہر خوشنودیِ شاہ فرد خویش

انسان اپنے گناہوں کی ذمہ داری سے بری ہو کر شیطان کی طرح۔

"اے خدا تو مرا در ظلمت انداختی"

نہیں کہہ سکتا۔ ایک دن ایک چرواہے کو حضرت موسےٰ نے اس کی بے ادبانہ گفتگو پہ جھڑکی دی تو خدا موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کرتا ہے :-

"آج تو نے میرے خادم کو مجھ سے جدا کیا۔"

خدا ظاہری کلام کی طرف ملتفت نہیں بلکہ ہر شخص کے

دل پر نظر کرتا ہے۔ مختلف مذاہب میں مختلف طریقوں سے پرستش ہوتی ہے۔ لیکن خدا کے لئے دل اہم ہے، چونکہ قلب جوہر ہے اور زبان عرض، جب محبت کامل ہو جاتی ہے تو ظاہری صورتیں بے حقیقت ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ عقیدۂ خلوص اور صدق نیت ہے جو سر اقبال کی تصانیف میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس طرح مولانا روم ؒ کا عقیدہ ہے کہ تمام مذاہب دراصل ایک ہیں۔ تمام لوگوں کی حمد و ستائش ایک نہر میں جا کر متحد ہو جاتی ہے۔ (جو شے ایک شخص کے لئے زہر ہے ممکن ہے دوسرے کے لئے شہد ہو)۔

ایک مرتبہ ایک ترک، عرب، ایرانی اور روس ہم سفر تھے اور ایک درہم کے خرچ کرنے میں مختلف الرائے ہو کر لڑجھگڑ رہے تھے۔ لیکن دراصل ہر ایک اپنی اپنی زبان میں انگور کے خریدے جانے پر اصرار کر رہا تھا۔ پس مختلف عقاید کو جنگ و جدل کا باعث نہ ہونا چاہیئے۔ نیز مولانا عقل کے پاؤں کو چوبین اور سخت اور بے تمکیں کہہ کر علم کشفی کی اہمیت بیان کرتے ہیں لیکن تقلید کورانہ کے مقابلہ میں عقل کی ایک گونہ اہمیت کے قائل ہیں۔ ؎

بے ز تقلیدی نظر را پیشہ کن
ہم برائے عقل خویش اندیشہ کن

سر اقبال میں مثنوی کی رعایت نظر آتی ہے، رومی انسان کی بتدریج نشو و نما کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بناء برایں ممکن ہے کہ آئندہ انسان ملکی و ملکوتی اور لاہوتی خصائل سے مزین

ہو کر اپنی اصلیت مجرد کی طرف بازگشت کرے ۔ کہتے ہیں صاحب رجا کے ہاتھ میں لوہا موم ہو جاتا ہے ۔ ارشاد مبارک ہے ۔ خدا کے سچے خادم لقمان کے مانند اپنے مالک کے عطا کردہ ترش ترین پھل کے کھانے میں بھی مسرت بے اندازہ محسوس کرتے ہیں ۔ انسان خدا کی ذات سے اپنی خودی کے الگ ہونے کا خیال ہی نہ لائے ۔ بس یہی فنا ہے ۔ اس مقام پر سر اقبال اور مولانا رومی میں اختلاف نظر آتا ہے لیکن جاننا چاہئے کہ اختلاف لفظی ہے ۔ مولانا کہتے ہیں کہ روح کامل کے ساتھ جو حصہ مادیت یا جسمانیت کا لگا ہے اور جس کا مقتضائے فطرت انسان کو ہوا و ہوس میں مبتلا کرتا ہے ۔ اس حصہ کو معدوم کر کے انسان کو مجسمہ نور بن جانا چاہئے ۔ اور پھر اس احساس کو کہ وہ غیر از نور خدا ہے دل سے دور کر دینا چاہئے ۔ لیکن سر اقبال کا عقیدہ ہے کہ خودی خدا کی روح قدس کا ایک ایسا ذرہ ہے جو انسان اور تمام اشیائے عالم پر مسلط ہے ۔ انسان کو چاہئے کہ اس ذرہ کو یہاں تک طاقت پہنچائے کہ اس میں خورشید کی کیفیت پیدا ہو جائے ۔ مولانا گریہ وزاری اور رقت قلب کو آب حیات اور شفاء کہتے ہیں ۔ جس کی قیمت روح انسان کے ایمان کی قیمت کے برابر ہے اور عنایت الٰہی اس گریہ وزاری پر منحصر ہے ۔ لہذا کہتے ہیں :-

"تا نہ بارد ابر کے خندد چمن"

لیکن یہ روح کی بے قراری چشمہ حیات سے پیوستگی کے اشتیاق کا باعث ہے ۔ وہ وہ خزانہ ہے جس میں عنایت

در پردہ موجود ہیں جس طرح کہ بہار موسم خزاں میں پنہاں ہے۔

مولانا ارسطو کے زریں اصول اخلاق کو ایک اصلاحی صورت میں جلال الدین دوانی کے مانند اعتدال کی دو قسم قرار دے کر پیش کرتے ہیں۔ اعتدال حقیقی جو کسی صاحب حکمت کا مقرر کردہ ہو۔

دوسرا اعتدال اضافی جو ہر شخص کی عادت ماحول پر مبنی ہو۔ مثلاً وہ شخص جو چار روٹی روزانہ کھائے وہ دو روٹیاں کھائے تو اعتدال ہے۔ اور اگر چاروں روٹیاں کھائے تو حد اعتدال سے باہر ہے۔ مولانا کے نزدیک ضمیر کی آواز کی وہی اہمیت ہے جیسی کہ بٹلر کے نزدیک جو اصول آواز ضمیر کا موجد تصور کیا گیا ہے۔

سر اقبالؒ کی طرح مولانا انسان کو خلیفہ خدا، مالک روئے زمین تسلیم کرتے اور "لا رہبانیت فی الاسلام" پر ایک پر مغز بحث کرتے ہیں جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ خلوت گزینی احکام مذہبی کے خلاف ہے۔ خدا کو مسبب الاسباب قرار دیکر کہتے ہیں، اگرچہ شراب پیالے میں ہے لیکن پیالے کے اندر سے پیدا نہیں ہوتی۔ ساقی جو شراب کا دینے والا ہے مستحق شکریہ ہے نہ کہ پیالہ۔ سر اقبالؒ نے مولانا رومیؒ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔

ابن العربی "فصوص الحکم" کے مصنف کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کی وجہ سے کامل ہو سکتا ہے۔ خود شناسی خداشناسی کا ذریعہ ہے۔ پیر کامل کی رہنمائی ضروری ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں تین منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ (۱) کمزوری

(۲) طاقت (۳) مکرر کمزوری۔ یعنی اول جہالت کی وجہ سے انسان کمزور ہوتا ہے۔ دوسری منزل میں طاقت کے ذریعہ اثبات خودی کرتا ہے۔ تیسرے درجے میں اس علم کی وجہ سے کہ وہ خود ایک بزرگ ہستی کے مقابلہ میں ذرہ ناچیز ہے عجز کی طرف رجعت کرتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں۔ انسان تزکیہ نفس کے وسیلے سے عقل کل کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اس درجے میں پہنچکر نجات شخصی کا ہی طلب گار نہیں ہونا چاہئے بلکہ دوسروں کی رہبری کے لئے اپنے اختیار اور ارادے سے نیچے اترنا چاہئے۔ لذات دنیوی سے پرہیز، خوفِ خدا اور علم کشفی کا اکتساب قابل ستائش ہے۔

محمود شبستری کی تصنیف گلشن راز، مسائل تصوف کی معتبر کتاب ہے اس میں بطور سوال وجواب تصوف کے نکات بیان کئے گئے ہیں۔ جسکی تضمین سر اقبال نے گلشن راز جدید کے عنوان کی ایک نظم میں کرتے ہیں۔

عبدالکریم الجیلی کی مشہور تصنیف انسان کامل ہے۔ مصنف کے عقیدے میں انسان کامل وہ ہے جس میں کل صفات الہی منعکس ہوں۔ دراصل انسان حامل صفات الہی ہے۔ لیکن اپنی جہالت کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت سے بیگانہ ہوتا ہے۔ یہی صفات الہی وہ امانت ہے جو دریا پہاڑ۔ آسمان۔ زمین کو پیش کی گئی تھی اور وہ اس بوجھ کے متحمل نہ ہوسکے۔ لیکن انسان نے جو "ظلوم وجہول" تھا اس بار امانت کو اپنے کمزور کندھوں پر اٹھانے کی حامی بھری۔ ارشاد ہے انسان جسم اور روح کو انوار خداوندی

کے ایک ایک ذرّے سے مرکب ہے۔ اس ذرہ روح القدس سے آگاہی پانا نفس معرفت ہے۔ روح جسم انسان میں متعدد صورتوں میں مثل روح حیوانی۔ روح حاکمانہ۔ روح عتابی۔ رُوح مطمئنہ ظاہر ہوتی ہے۔

انسان کامل کو تین منازل طے کرنا پڑتا ہے۔ درجۂ اول میں وہ اسمائے الٰہی پر غور و فکر کرتا ہے۔ اور ہر اسمِ الٰہی قلب انسانی کے ایک حصہ کو منور کر دیتا ہے۔ آخر کار اس نورِ حق کی تجلی میں انسان کا ارادہ انفرادی فنا ہو جاتا ہے۔ دوسرے درجے میں اوصاف الٰہی سے سالک اپنی استعداد اور خلوص کی مناسبت سے کم و بیش متاثر ہوتا ہے۔ آخری منزل میں انسان کامل ہو کر خدا سے متحد ہو جاتا ہے اور عوام اور خدا کے درمیان بطور ایک سلسلے کی کڑی کے بن جاتا ہے۔

نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ نے اپنی کتاب "لوائح" میں تصوف پر عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے اور کم و بیش ان کے عقائد مولانا رومیؒ اور محمود شبستری سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن اس میں فلسفہ کا اثر و عنصر اس قدر غالب ہے کہ وہ ایک اچھی خاصی فلسفیانہ تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی اولین صوفی اور مقتدر بزرگ گزرے ہیں۔ ملفوظات مبارک کا مجموعہ جو بنام دلیل العارفین شائع ہو چکا ہے نماز و عبادات کی تاکید اور اتباع سنت کے فضائل سے لب ریز ہے۔ آپ کے پیرو بختیار کاکی شیخ فرید الدینؒ شکر گنجؒ۔ نظام الدینؒ اولیاء

علاؤالدین علی احمد صابر اور شیخ سلیم ہیں۔ ان میں سے خواجہ نظام الدین اولیاء کو ہندوستان میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ آپ کا زمانہ ساتویں اور آٹھویں صدی کی ابتدا کا ہے ارشاد ہے کم سخنی۔ کم آمیزی۔ کم خوابی اور کم خوری کمال کی شرطیں ہیں۔

نیز کہتے ہیں کہ تصوف سے مراد ظاہر اور باطن کی پاکیزگی ہے۔ عالم بیخبر یا سکر میں بھی سالک پر احکام شریعت کی پابندی واجب ہے۔ ترک دنیا کے یہ معنی نہیں کہ انسان خوراک اور پوشاک کو ترک کردے۔ البتہ جو کچھ کماتا رہے خرچ کرتا رہے جمع کرکے نہ رکھے۔ اور دنیا کی کسی چیز میں اپنا دل لگائے ہوئے نہ رہے۔ کہتے ہیں۔ محبت کی کسوٹی متابعت احکام الٰہی ہے۔

داراشکوہ پسر شاہجہاں نے اپنی تصنیف مجمع البحرین میں صوفیائے کرام اور ویدانتیوں کے عقاید میں تطبیق کرنے کی کوشش کی۔ شہزادی زیب النساء دختر اورنگ زیب نے بھی صوفی تھیں۔ اور آخری مغل بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ نے صوفیانہ نکات کو شعروں میں بیان کیا ہے۔

لیکن واضح ہو کہ اس دور میں ابن عربی کے اثر سے نظام تصوف میں فلسفیانہ عنصر کو غلبہ ہونے لگا اور بہت سے مابعد الطبیعات کے مسائل زیر بحث و مذاکرہ رہے۔ یہ موجودہ مسخ شدہ صورت یونانی اوہام۔ ہندی مراسم اور دیگر غیر اسلامی عناصر کا مجموعہ مرکب ہے۔

اسلامی تصوف کی صحیح معنوں میں آخری دعوت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے فرزند ارجمند شاہ عبد العزیزؒ نے دی تھی۔ در اصل تصوف کا دور انحطاط یورپ کے اثر کی وجہ سے ہوا جبکہ لوگ روحانیت کو پس و پشت ڈال کر مادیت کی ترقی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور بعض متاخرین نے تصوف کو کسالت بطالت۔ فقیری اور ریاکاری کے لئے آلہ کار بنا لیا۔ تو خود بخود اسلامی تصوف میں زوال واقع ہو گیا۔

اس وقت رحمت باری میں جوش پیدا ہوا اور وعدہ الٰہی کہ " بوقت ضرورت ایک مصلح کو تمہاری ہدایت کے لئے بھیج دوں گا ایفا ہوا " اس مصلح اعظم نے اسلامی تصوف کی شمع لے کر مشرقی زوال پذیر متصوفین و مغربی مادہ پرستوں کے درمیان ظہور کیا۔

اس کا پیام نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ کل دنیائے اسلام کے لئے بانگ درا ثابت ہوا۔ اس کا تصوف نئی شکل میں پاکیزگی اخلاق اور فلسفیانہ مباحث کو ہمراہ لئے ہوئے نمودار ہوا۔ اس کا مقصد گمان آباد شہر فلسفہ کے باشندوں سے ان کی زبان میں ہی گفتگو کر کے ان کو شہر طمانیت کی طرف لے جانا ہے۔ در اصل یہ شان دار ہستی پیکر اقبال میں رونق افروز ہند ہوئی [1]

---

(۱) THE SAINT AND MYSTIC OF ISLAM BY MR. CLAD FIELD

(۲) OUTLINE OF ISLAMIC CULTURE VOL II BY PROF. M. A. SHUSTERY

# باب اوّل

## اقبال

علاّمہ اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تھے۔ آپ کے بزرگ سوا دو سال پہلے ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی بناء پر مسلمان ہوگئے تھے۔ اقبال ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج طے کرنے کے بعد آپ نے اسکاچ مشین کالج سیالکوٹ سے ایف۔ اے امتحان پاس کیا۔ اور بی۔ اے میں فلسفہ لے کر لاہور کالج سے کامیابی حاصل کی۔

مسٹر آرنلڈ کے فیض صحبت نے ان کے دل میں فلسفہ کا مذاق پیدا کردیا۔ جس میں آپ نے اس کالج سے ایم۔ اے کی ڈگری

---

(۳) تصوف اسلام

(۴) مثنوی رومی

(۵) گلشن راز محمود شبستری

(۶) ENCYCLOPEDIA OF RELIGION AND ETHICS BY MR. HASTINGS.

(۷) امام غزالی

حاصل کی۔ اس کے بعد کچھ دن اورنٹیل کالج میں بحیثیت مددگار
پروفیسر فلسفہ و انگریزی کام کرتے رہے۔ انھوں نے یہ زمانہ بھی
مشاغل علمی میں صرف کیا۔ پھر آپ شوقِ علم کی بدولت سفر
یورپ پر آمادہ ہوئے۔

کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری کی تحصیل کے
بعد جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (P.h.D)
کے امتحان میں ایک مقالہ "ایرانی مابعد الطبیعیات" پر اعلیٰ کراول
درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ جرمنی سے لنڈن واپس آکر بیرسٹری
کا امتحان پاس کیا۔

انگلستان کے قیام کے دوران میں آپ کی ذہانت و ہمہ
گیر علم کا چرچا زباں زدِ خاص و عام ہوا۔ اور آپ پروفیسر آرنالڈ کے
قائم مقام کی حیثیت سے لنڈن یونیورسٹی میں چھ ماہ تک پروفیسری
کی خدمت انجام دیتے رہے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں وطن واپس
ہوئے۔ اس کے بعد کا زمانہ وہ ہے، جس میں آپ کے علم و فضل
کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور آپ اپنا ایک نصب العین متعین کرکے
اس کی اشاعت میں سرگرم کار ہوتے ہیں۔

آپ کا دستور العمل صرف ملتِ اسلامیہ کے لئے ہی نہیں بلکہ
کل اقوامِ عالم کے لئے ہے۔ تاکہ اس کی رو سے ایک عالمِ نو تشکیل
ہو جس میں کل افرادِ انسانی متحد ہو کر گامزنِ عمل ہوں۔ انگلستان
سے واپس ہو کر بھی آپ نے متعدد اردو نظمیں لکھیں جن میں
شمع و شاعر۔ شکوہ۔ جواب شکوہ۔ خضرِ راہ۔ طلوعِ اسلام جیسی

حرکت، تار انظمیں شامل ہیں۔ مگر اصل کام جس سے اقبال کا نام یورپ و ایشیا میں یکساں مشہور ہوا وہ آپ کی فارسی تصانیف ہیں۔ ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۵ء میں "اسرار خودی" و "رموز بے خودی" شائع کیں جس کا ترجمہ یورپ کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

آپ کے اردو کلام کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے آپ کی تصنیف "پیام مشرق" نے فارسی دنیائے ادب میں چل چل مچا دی۔ ۱۹۲۸ء میں "زبور عجم" فارسی زبان میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے اپنے سفر مدراس۔ بنگلور حیدرآباد کے دوران میں چھ پبلک لیکچر دیئے جو

RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے آپ کی شاعری کا آخری دور شروع ہوتا ہے اور ۱۹۳۲ء میں "جاوید نامہ" لکھ کر اسرار حقائق کی پردہ کشائی کرتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" شائع ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" مع مسافر لکھی گئی۔

اس زمانے میں سر اقبالؒ کے اردو کلام کا مجموعہ "ضرب کلیم" کے نام سے نکلا۔ ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء میں آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ آخرکار مشرق کی اس عظیم المرتبت ہستی نے ۲۰ اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی درمیانی رات کو جان شیریں جان

آفریں کہ کر سپرد کی۔

آپ کا کلام چار دوروں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں اقبال کی پہلی نظم "ہمالہ" رسالہ مخزن میں شائع ہوئی۔ یہ ان کی شاعری کا آغاز ہے۔ اس وقت سے ۱۹۰۵ء تک کا کلام پہلے دور میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسرا دور یورپ میں آپ کا زمانۂ قیام یعنی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تک۔ تیسرا دور یورپ کی واپسی کے بعد سے ۱۹۳۰ء تک اور دورِ چہارم ۱۹۳۰ء سے آپ کی وفات تک ہے۔

اقبالؒ کے کلام کی ادبی خوبیوں پر تبصرہ ہمارے نفسِ مضمون سے باہر اور باعثِ طوالت ہوگا۔ رسالہ نیرنگ خیال کے ستمبر اور اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اقبال نمبر میں ایک مضمون بعنوان "کلام اقبال کی ادبی خوبیاں" جناب محمد اکبر خاں بی۔ اے (آنرز) مترجم لیجسلیٹو کونسل پنجاب۔ اور رسالہ اردو بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اقبال نمبر میں ایک مضمون "اقبال اور آرٹ" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس) شائع ہوا ہے۔ اور ایک کتاب بنام "اقبال" مولوی احمد الدین صاحب بی۔ اے (پنجاب) نے لکھی ہے جس کے آخری حصے میں آپ نے اقبال کے طرزِ بیان کے متعلق ایک پُر مغز بحث کی ہے۔ الغرض آپ کے طرز کے متعلق مضامین مذکور بالا کی طرف قارئین کرام کی توجہ منعطف کی جا سکتی ہے۔ جنہیں آپ کے کلام کا مطالعہ محض شاعری کا لطف اٹھانے کے لئے اہم

نہیں ہے بلکہ آپ کے مضامین کلام کو اپنی روح کی گہرائیوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ تصوف کی گہری حقیقتوں کو شاعری کے نرم و نازک قالب میں پیش کرنا اقبالؒ کے ہی سریع الحس ذہن کا کام تھا۔

اقبالؒ ابتداء میں اپنے اشعار کی داغ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ مولانا حالیؒ اور اکبر کے ہم عصر تھے۔ لہذا ان کے کلام میں خصوصاً" ابتدائی نظموں میں داغ کے جیسی فصاحت و بلاغت نظر آتی ہے۔ حالی کی طرح آپ نے مسلمانوں کی حالت بے کسی کی مصوری کی اور کبھی کبھی اکبر کی طرح ظریفانہ انداز میں یورپ کی اندھا دھند تقلید اور اس کی برائیوں پر طعن آمیز چوٹ لگاتے رہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام میں چند مخصوص خصوصیتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کو ایک طرح سے اسلامی تصوف کا بہترین مفسر کہا جا سکتا ہے اور دوسری حیثیت یہ تھی کہ آپ کے کلام کے بعض حصوں سے صوفیائے کرام کے ایک طبقے میں کھل بلی مچ گئی۔ اور کو دشمن صوفیا کہا گیا۔ اقبال صرف فطری شاعر ہی نہیں۔ بلکہ وہ زمانۂ حال اور قدماء کے فلسفے اور تصوف اسلامی اور مدرسے عقاید الہٰیت (THEORIES OF GOD HEAD) سے کامل واقفیت رکھتے تھے۔ غور اور فکر اور فلسفہ کی قابلیت ان کو "وراثتاً" ملی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس

کے ساتھ ان کو والہانہ عقیدت تھی۔ گوکہ انھوں نے تعلیم جدید سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن انکی ہمیشہ تڑپنے والی روح مختلف انداز سے جلوہ دکھاتی رہی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک عرصۂ دراز تک ظلمت آباد حکمت اور مغربی فلسفے کے مطالعے میں مشغول رہے۔ لیکن ازلی نظر صانع آپ کو منزل مقصود کی طرف کھینچ لائی۔ اور ذہنی ارتقاء کے مدارج طے کرتے ہوئے پیام ابدی مولانا رومؔ کی رہبری میں سیکھا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ ہے۔ جب انکی شاعری کا تیسرا دور ختم ہوتا ہے۔

جب آپ کی نظر قلب اس منزل پر پہنچ چکی تو آپ کا روحانی معراج تکمیل پایا۔ کلام کا انداز بیان ناصحانہ و دعائیہ ہوگیا۔ الغرض ان کے علم و ہنر و کمال اور رجحان شاعری مناسب و موزوں طبع سے ایک ایسا عظیم الشان گلشن اور سبزہ زار پیدا ہوتا ہے جس کے مانند کوئی دوسری شی شاید یہ دنیائے فانی نہ پیش کرسکے۔ پس صفحات ذیل میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اقبال کے اس گلشن سدا بہار اور خزاں نادیدہ اور زندۂ جاوید گلشن کی تصوف کے نقطۂ نظر سے سیر کی جائے۔

# دورِ اول ۱۹۰۵ء تک

**تمہید** اس زمانہ میں قومی شاعری آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیت تھی۔ ملک و ملّت کی سیاسی بدمستی کا احساس آپ کو بے چین کئے دیتا تھا۔ آپ کی بہترین نظم "تصویرِ درد" جو آپ کی وطنی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے سنہ ۱۹۰۴ء مارچ میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے موقع پر پڑھی گئی۔

اس میں اپنی سیاسی پستی کی دردناک داستان بیان کرکے ہندوستان کے امتیاز ملت و آئین کی تصویر کھینچ کر ہندوستان کے نظارے کو کل انسانوں سے بڑھ کر عبرت خیز ظاہر کرکے اقوام ہند کو عمل کی طرف ابھارتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے نفاق کی مذمت کرتے ہیں۔ سب رس اقبال نمبر میں ایک مضمون بعنوان "اقبال تاریخ وطن کے آئینہ میں" جو محمود تیابدکا لکھا ہوا ہے۔ اس کے خاتمے میں وہ لکھتے ہیں

"اقبال حیات قومی کی تخلیق پر مسیحا کا حکم رکھتا ہے۔ یہ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب نے لکھا ہے:۔

جنگ طرابلس کے زمانے میں اقبال کا کلام نمایاں

عالم پر عربوں کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا۔ ہندوستان افلاس کی وجہ سے توپ اور تفنگ اور سامانِ حرب نہیں رکھتا۔ لیکن اقبال کا کلام رکھتا ہے۔

اس دور میں اقبال نے بچوں کے لیے متعدد اخلاقی نظمیں اور ترانے لکھے۔ بچے کی دعا۔ ہمدردی۔ ماں کا خواب۔ پرندے کی فریاد۔ ایک مکڑا اور مکھی۔ ہندوستاں ہمارا۔ میرا وطن وہی ہے۔ ایک پہاڑ اور گلہری یہ نظمیں اپنے آسان اور موثر انداز کی وجہ سے بے انتہا مقبول ہوئیں۔

اس دور کے کلام میں مشرقی تصوف کی جھلک بھی کہیں کہیں نمودار ہوجاتی ہے۔ وہ موجودات کا مطالعہ گہری نظر سے کرتے ہیں اور فطرت کی دل کشیاں ان کے لیے جاذب نظر ہوتی ہیں۔

عشق مجازی کی سحر آفرینیاں بھی کہیں کہیں نمایاں ہیں۔ کبھی کبھی وہ اسرار کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ فطرت کے نظر فریب نظاروں میں ان کی نگاہ تجسس حقایق کو نہ پاکر مایوس ہونے لگتی ہے اس دور میں ہنوز ان کا نصب العین معین نہیں ہوتا متعدد جذبات ان کے دل و دماغ میں موجزن ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا دل ہر قسم کی بندشوں سے آزاد رہنا چاہتا ہے۔ تاکہ رازِ حیات سے آگہی کی پیہم تگ و دو

میں آسانی ہو۔ اس دور میں یاس و بے چینی کے ہمراہ افشائے راز کی جھلک بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ انسان کے "مسجودِ ساکنانِ فلک" ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جانتے ہیں کہ اس کا شعور کائنات میں اس کا درجہ اور بارِ امانت "الٰہی" کا حاصل ہونا کل مخلوقاتِ عالم میں اس کو ممتاز کر دیتا ہے۔ عشق و محبت کی وقعت ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

## فطری شاعری۔ مناظر قدرت کی مصوری

اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اقبال کے کلام میں صوفیانہ انداز ہر دور میں نمایاں ہے۔ مناظر قدرت کے مشاہدے سے انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کے مانند آپ کا قلب متاثر ہوتا ہے۔ رموز فطرت میں ایک نئی دنیا نظر آنے لگتی ہے جس کے انکشاف پر وہ دیوانہ وار آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی ابتدائی شاعری فطری شاعری کہلائی جا سکتی ہے۔ جہاں ان کے پرواز تخیل اور رغبتِ فکر نے طلسم ہوش رُبا کا سماں باندھا ہے۔ یہ امر لازمی ہے کہ عشق سے پہلے حسن کا جلوہ نظر آئے۔ لہٰذا نظامِ کائنات کا ہر ذرہ حسن ازل کی وہ بہار دکھاتا ہے۔ شاعر اس پر فریفتہ ہو کر از خود رفتگی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے۔

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن

دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشہ کرے کوئی

حسن و عشق کا میدان شاعر کی طبع رسا کا جولان بنجاتا ہے۔ تصوف کی چاشنی سے کلام لذت بخش ہو جاتا ہے اور رموز حقایق و اسرار کائنات کے وہ وہ دفینے باہر آنے لگتے ہیں۔ کہ عقل کوتاہ بیں انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔ نظم "ہمالہ" میں شاعر نے مناظر قدرت کی انتہا درجے کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے، جو ان کی قوت مشاہدہ پر دلالت کرتی ہے۔

جانے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی طرح اڑا جاتا ہے ابر
آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
لیلی شب کھولتی ہے آ کے جب زلف رسا
دامن دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگ شفق کہسار پر
خوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

"ماہ نو" "انسان اور بزم قدرت" "پیام صبح"

"عشق اور موت" میں مناظر فطرت کی مصوری اور کمال شاعری کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رجحان بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
(بانگ درا صفحہ ۹۵)

مطالعہ آفاق میں ان کی نگاہِ حقیقت بیں اسرار تصوف کا مشاہدہ کرنے لگتی ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
کھولی ہے ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہ گذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ
(غزلیات صہ ۱۰۰)

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اس کی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود
(رخصت اے بزم جہاں صہ ۵۹)

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہے
ہر شے میں جب کہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہے

جگنو ۔ صہ ۸۴

نیز فرماتے ہیں :۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ باوجود ان گوناگوں مشاہدات کے شاعر کی نگاہ تشنۂ کام و اُنلی زمانے میں مضطرب اور بے تاب رہی۔

آنکھ دنغ دید تھی، لب مائل گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

اور عالم بے تابی میں کبھی کبھی ناکامی اور مایوسی کی حالت میں اکتانے لگتے ہیں۔ ایک آرزو ان کی ناکامی طلب کی صدائے صدائے بازگشت ہے۔ شاعر کا دل بجھ جاتا ہے۔ اور وہ فطرت کی خاموشی میں سکون قلب حاصل کرنے کا متمنی نظر آتا ہے۔ اس نظم میں ایک طرف تو فطرت کی تصویر کشی میں شاعر کی معجز بیانیاں نظر آتی ہیں۔ اور دوسری طرف شاعر کا انتہائی یاس کا عالم دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر اقبال کے کلام میں روایتی تصوف کی جھلک نمودار ہونے لگتی ہے۔ انتہائے یاس کی حالت میں فرمانے لگتے ہیں :

آیا ہے تو جہاں سے مثال شرار دیکھ
دم جائے نہ جائے ہستی ناپائیدار دیکھ
دائے ناکامی! فلک نے تاک کر توڑا اسے

بیہانے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کے لئے

غرض اس دور میں اقبالؒ کا کلام بے تابی، جستجو، تڑپ اور درد سے پُر نظر آتا ہے۔ شاعر کا دل گوناگوں کیفیتوں کا دست خیز بن جاتا ہے۔ اور اس میں تصوف کا محرم راز ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

**تصوف و فلسفہ کا رنگ** اس دور میں ہی اقبالؒ کے کلام میں تصوف و فلسفہ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ لیکن یہ اپنی تصوف کی ابتدائی منزلیں ہیں جنہیں جستجو کی تڑپ اور بے قراری سالک کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ گل رنگیں کا نظارہ بھی اقبال کے جذبات میں ہیجان برپا کر دیتا ہے۔ اسکی تمناؤں سے میرا زندگی کا مقابلہ اپنی زندگی سراپا سوز و ساز آرزو سے کرتے ہیں۔ اور اس کی طمانیت اور اپنی ذوق جستجو کی شمشیر سے گھائل پریشانی کا موازنہ کرتے ہیں۔ تصوفانہ انداز میں فرماتے ہیں :-

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھنوں سے پڑا
دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

پھر گل رنگیں کی خاموشی اور اس کے اسرار پوشیدہ سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔

زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں

اس چمن میں ہیں سراپا سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

ابتداء ہی سے اقبالؔ کی روح رموزِ حیات کے سمجھنے کے لیے بے تاب رہتی ہے اور ہنگامہ آرائیوں سے خاص لطف حاصل کرتی ہے۔

دور طفلی میں اگر کوئی رلاتا تھا مجھے
شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے
آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا میرا سراپا ذوقِ استفسار تھا

کبھی کبھی بے تاب ہو کر خفتگانِ خاک سے استفسار کرنے لگتے ہیں۔

وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی
اور پیکارِ عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوزِ شمع پر پروانہ کیا
اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا

---

واں بھی انساں اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا
امتیازِ ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا
واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں

اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا
واں بھی انساں ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا
آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے
تم بتا دو راز جو اس گنبدِ گردوں میں ہے
موت ایک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے

صوفیانہ رنگ میں ہندو حکیموں اور کانٹ (KANT) کی طرح عبادت بے غرض کے متعلق فرماتے ہیں۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

پروانے کو شمع پر فدا ہوتے دیکھ کر آپ کے قلب میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔

آزار موت میں ہے آرامِ جاں ہے کیا
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا
گرنا تیرے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے
کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے۔

شمع و پروانہ ص ۲۷

آفتاب سے چشمِ خرد کے نور کے خواہاں ہوتے ہیں۔

اے آفتاب ہمکو ضیائے شعور دے　　چشم خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

پھر آفتاب سے خطاب کرتے ہیں اگر تو حسن جہاں آرا سے آگاہ نہ ہو تو آدم کے دروازے کی خاک کے ذرّے کا بھی ہمسر نہیں ہوسکتا۔ انسان کے دل میں اسرار حقایق سے آگاہ ہونے کی آرزو ہے۔ اور ذوق طلب سے اس کا دل مملو ہے۔ وہ اس مشکل عقدے کو واکرنے میں عجیب لذّت محسوس کرتا ہے۔ سعئ بے حاصل سے بھی انسان متلذذ ہوتا ہے۔ اسکے برعکس خورشید جستجو اور درد تجسس سے محروم ہے۔

درد استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے راز قدرت کا شناسا تو نہیں

یہی وہ عقیدہ ہے جو سر اقبال کو عام مروجہ تصوف سے ممیّز کرتا ہے۔ ان کا تصوف تڑپ اور عمل پیہم ہے جس سے عوام کے عقاید قضا و جبر کو ضرب قوی لگتی ہے۔

اقبال کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ نئی روشنی میں درد عشق کو خیال محض تصور کیا گیا ہے۔ لہذا آپ دردِ عشق سے اس طرح خطاب کرتے ہیں، اگرچہ تجھے نئی روشنی میں شدید صدمہ پہنچا ہے اور تیری نمود میں اگلی سی لذّت باقی نہیں رہی۔ تاہم تجھ کو خود نمائی کا خیال نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ نالۂ بلبل کا منت کش ہونا روا ہے تو سینہ میں در پردہ مقیم رہ اور پرواز تخیل کا خواہاں بن نظر حکمت پسند کو حیرت میں رہنے دے۔ دنیا دار اصل مجازی اشیأ

کے دیکھنے میں مصروف ہے تو رازوں کی تہ تک پہنچنے میں مشغول ہوجا۔ گُلِ پژمردہ کو دیکھ کر مولانا رومیؒ کی طرح فرماتے ہیں:۔

ہمچو نے از نیستاں خود حکایت می کنم
بشنو اے گل از جدائی ہا شکایت می کنم

اس کی افسردگی میں اپنے دل کی ویرانی کو مشاہدہ کرتے ہیں۔

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدہ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جسکی ہے تعبیر تو

سید کی لوحِ مزار دیکھ کر کہتے ہیں اپنی قوم کو تعلیم دینے کے بھیس میں ترکِ دنیا کی تعلیم نہ دے اور نہ فرقہ بندی کے لیئے زبان کو کھول۔ سر اقبالؒ مولانا رومیؒ کی طرح عقیدہ "لا رھبانیت فی الاسلام" کو قوم میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو ابتداء سے ہی اس بات کا احساس تھا کہ قوم کے جمود اور تباہی کا باعث بعض ناعاقبت اندیش علمائے کرام کی ترکِ دنیا کی تعلیم ہے۔

کبھی واصلِ حق ہونے کے متعلق رندانہ وار فرماتے ہیں

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی

جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے
قوموں کا جمود تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہی وہ
جمود ہے جو ہندو فلسفہ میں تمس کے نام سے مشہور ہے۔
یہ انسان کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ سر اقبال کا عقیدہ
ہے کہ انسان میں بہت سی قابلیتیں ہیں لیکن وہ بوجہ اپنی
کم فہمی کے ان کی نشو و نما تو درکنار ان کو استعمال بھی نہیں
کرتا۔ سپند کے مانند وہ اپنے شور و شر کی صدا کو گرہ میں
باندھ رکھتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے قواء پوشیدہ
سے آگاہی پائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کو گرین (SREEN)
"معرفت نفسی" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ جس کے آگے
بٹلر (BUTLER) کا عقیدہ "صدائے ضمیر" اور مل (MILL)
کا نظریہ افادیت اور کینٹ (KANT) کا فلسفۂ اخلاق ٹھہر نہیں
سکتے۔ گرین سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے مطالعۂ انفس
کی تاکید کی اور مشرقیوں نے تو اس پر اتنا زور دیا کہ لوگ
رہبانیت کے پیرو ہو گئے۔ سر اقبال عمل کی تاکید کرتے ہوئے
آفاق و انفس کے مطالعے کو ضروری بتاتے ہیں اور عقل
کو مطالعۂ آفاق کے لئے اور قلب کو انفس پر غور کرنے
کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ کے لئے حقیقت قلب
انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

معو خیانہ انداز میں استغنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہئے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

فرماتے ہیں آزادی کی جڑ محبت میں پوشیدہ ہے۔

"جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں۔
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

اگر امتیاز نسب و رنگ و ملک کو مٹاکر نوع انسانی ایک رشتے میں منسلک ہوجائے تو سارے مشکلات رفع ہوجائیں۔ ذوق طلب۔ ہمت۔ تخیل کی بلندی اور خود داری نوع انسان کا لائحہ عمل ہونا چاہئے۔ اگر انسان کے دل ذوق دیدار یار ہو تو ہر رہ گذر میں اپنے دوست کے کفِ پا کے نقش کو ملاحظہ کرنے لگے گا۔ صاحب بصیرت اشخاص خدا کو کائنات ہی میں دیکھ لیتے ہیں۔ پھر وعدہ حشر کا کیوں انتظار کریں۔

عشق کی تکالیف کو خندہ جبینی سے برداشت کرنا عاشق کا خاصہ ہے ؎

جفا جو عشق میں ہوتی ہے وہ جفا ہی نہیں
ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

سرگذشت آدم میں حضرت آدم اپنی انقلاب پسند فطرت کی بناء پر بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاعر کو جگنو کی روشنی حسن قدیم کی پوشیدہ جھلک

بن کر نظر آتی ہے۔ نیز فرماتے ہیں موت فنا کا باعث نہیں بلکہ زندگی ہی ایک لطیف شکل میں جاری رہتی ہے۔

گو کہ جہاز زندگی آدمی رواں ہے یوں ہی
ابد کے بحر میں پیدا یوں ہی نہاں یوں ہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

بچہ شمع کو اشتیاق سے دیکھتا ہے اور اقبال نے اسکی حیرانی کو "کسی دیکھی ہوئی شئے کی پہچان" سمجھ کر تصوف و فلسفے کے نکات بیان کرتے ہیں، ورڈز ورتھ کا تصوف بھی اسی قسم کا ہے یعنے یہ کہ انسان کی روح جسم میں محبوس ہونے سے پہلے نورِ الٰہی سے منور ہوتی رہتی ہے ہم کو اس کی یاد نہیں کیونکہ اس وقت مادیت کی آمیزش نے ہماری قوتِ حافظہ کو دھندلا دیا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ بچہ روشنی کی طرف کیوں رغبت کرتا ہے۔ شاید یہ اس کی روح کی بیتابی کا نتیجہ ہو جو اپنی اصل یعنے نور سے بغلگیر ہونا چاہتی ہے لیکن شمع اور بچہ میں فرق یہ ہے کہ شمع صرف ایک شعلہ ہے لیکن بچہ نور سراپا نور ہے جو مادیت کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ گو کہ حسن کا طوفان کائنات کے ہر ذرے میں پوشیدہ ہے۔ لیکن روح کسی گم گشتہ شے کی ہوس میں بیتاب ہے۔ مولانا رومیؒ کے مانند سر اقبال روح کی آہ و زاری و بےتابی کو اپنے سراپا نور اصلیت سے جدا ہونے کا سبب

قرار دیتے ہیں۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس۔
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس
حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

دل کے متعلق فرماتے ہیں :-

قصۂ دار و رسن بازیِٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیِٔ افسانۂ دل
حسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل
عرش کا ہے کبھی کعبے کا ہے دھوکہ اس پر
کس کی منزل ہے الٰہی میرا کاشانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اس کو
رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اقبالؒ دوسرے صوفیائے کرام کے مانند درد و غم کو تکمیلِ عشق کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس دردِ دل کے خواہاں ہوتے ہیں جس سے جذبات میں ہنگامہ برپا ہو جائے۔ ان کے لئے سوز دروں تزکیۂ قلب کا پُر لطف ذریعہ ہوتا ہے۔

علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں

جو ننھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پس اقبال کا یہ ابتدائی تصوف ہے جس پر آگے چل کر آپ نے تصوف کی فلک بوس عمارت کھڑی کر دی۔ اس زمانے میں وارداتِ قلبی سے آپ بے خود ہوئے جاتے ہیں۔ مناظرِ فطرت کو پُر اسرار نگاہوں سے ملاحظہ کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں گو کہ آپ نے مسٹر آرنلڈ جیسے شفیق اور قابل استاد کے زیرِ نگرانی فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن آپ کو اطمینانِ قلب نصیب نہ ہوا۔ اس شخص کا دل جس کو خدا نے مصلحِ اعظم مقرر کر رکھا تھا، فلسفہ کی سطحی تعلیم سے کیونکر تسکین پاتا۔ امام غزالیؒ کی سوانح حیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے فلسفہ میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ یونانی و ایرانی فلسفہ کی کتابیں آپ کی زیرِ مطالعہ رہیں۔ لیکن فلسفہ کی تعلیم وتربیت صرف دماغ و عقل تک ہی محدود رہی اور تسکینِ قلب کے لیئے آپ کو تصوف کے آغوش میں لوٹ آنا پڑا۔ یہی حالت اقبال کی ہوئی۔ اور اس بے چینی کے عالم میں شرابِ علم کی لذت آپ کو یورپ جانے پر مائل کرتی ہے۔ اور آپ حضرت محبوبِ الٰہی کی درگاہ میں التجائے مسافر کے عنوان سے ایک نہایت ہی پُر درد موثر نظم پڑھتے ہوئے یورپ روانہ ہوتے ہیں :-

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

چھلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

# دور دوم - اقبال

## ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تک

**تمہید** یورپ پہنچ کر اقبال نے مشرقی اور مغربی عقاید کا گہرا مطالعہ کیا اور آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے سلسلہ میں یونانی فلسفے اور الکزانڈر ہیگل۔ نیٹشے۔ برگسان کے فلسفے سے بھی پوری پوری واقفیت حاصل کی۔ امام غزالیؒ۔ مولانا رومؒ اور حافظؒ کے عقائد سے بھی آشنا ہوئے۔ اگرچہ یہاں اقبال کو اپنی علمی مصروفیتوں کی وجہ سے شعر و شاعری کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ لیکن چند نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئی تھیں شاعر کے ذہنی ارتقاء کا پتہ دیتی ہیں۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر کی نظر بزم قدرت کی رازدار ہو چلی ہے۔ مظاہر قدرت کی گہرائیوں تک پہنچنے کی صلاحیت انھیں عطا ہو چکی ہے، جو اشیاء کہ پیش تر ان کے لئے صوت لا یحل تھیں اب زبان حال سے اپنی کیفیتوں کو سنا رہی ہیں۔ اب انکی سی مرشیانیاں باقی نہ رہیں اور آپ کی مضطرب طبیعت میں یک گونہ

اطمینان نظر آنے لگتا ہے۔ استفسار اور تجسس میں کمی واقع ہوتی ہے۔ آپ کا نصب العین معین ہو جاتا ہے اور مستقبل کے لئے آپ ایک دستور العمل تیار کر لیتے ہیں۔ مغربی قومیت کی برائیاں بچشم خود ملاحظہ کرتے ہیں تو آپ کو مقامی بندشوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور در اصل یہی آپ کی شاعری کے وطنی بندشوں سے آزاد ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ کی ملّی شاعری کے وطنی بندشوں سے آزاد ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ کی ملی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور اسلامی عقائد مساوات و اخوت کی خوبیاں واضح تر نظر آنے لگتی ہیں۔

**احساسِ حسن** احساسِ حسن اس دور کی نمایاں ترخصوصیت ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیاں جاذبِ نظر ہوتی ہیں۔ حسنِ انسانی بھی حسنِ حقیقی کا پرتو نظر آتا ہے اور آپ کو احساس ہونے لگتا ہے کہ ہر شے میں حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت موجود ہے ——— کی گود میں بلّی دیکھ کر" کہتے ہیں۔

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

دل کے ہر ذرّے میں پوشیدہ کسک ہے اسکی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اسکی

نیز فرماتے ہیں :-

جلوہ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
دور ہو جاتی ہے ادراک کی خامی جس سے
عقل کرتی ہے تاثر کی غلامی جس سے
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتم دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

**احساسِ زندگی** اس زمانے میں آپ کو فطرت کی ہر شے میں زندگی نظر آنے لگتی ہے اور وہ راز حیات کو حرکت اور جنبش میں ملاحظہ کرتے ہیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس راہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

علی گڑھ کے طلباء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

## مناظرِ قدرت کی دلکشی

اقبال کی ابتدائی نظموں میں مناظر قدرت کے دلکش "مرقعے" "ابر" "کنار راوی" میں کھینچے گئے تھے۔ انکی جھلک دور دوم کی شاعری میں "حسن و عشق" "ایک شام" "گل" جیسی نظموں میں نظر آتی ہے۔ کشتیٔ سیمیں قمر کے ڈوبنے میں آپ کو حسن کامل کا پتہ ملتا ہے۔ اور بزمِ فطرت آپ کے جذبات عشق و محبت کو ابھارنے لگتی ہے۔

اگر کوئی شئے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگاہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا
ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقت گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیماں ہے رنگ و بو کا
کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

نیز فرماتے ہیں:-

حسن ازل کا پردہ لالہ و گل میں ہے
کہتے ہیں بے قرار ہے جلوۂ عام کے لئے

عالم عشق اور فرط محبت میں کہتے ہیں:-

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

غمِ عشق کو تکمیلِ فرد کا باعث سمجھ کر کہتے ہیں:-

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے

میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے
حسن وجمال کے جلوے سے مست ہوکر دیوانہ وار کہتے ہیں
"حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا"
فرماتے ہیں :-

ہے میرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار
میرے بے تاب تخیل کو دیا تو نے قرار
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال
تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

دور اول میں "صبح کا ستارہ" سوز وعشق سے حیات ابدی پانے کا متمنی ہوتا تھا۔

تاکہ میں جل کے حیات ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں،

اب شاعر کا نظریہ بدل جاتا ہے اور "اختر صبح" کو عشق میں فنا ہونے کے عوض اپنے ریاض محبت میں سرسبز و شاداب ہوکر زندگیٔ جاوید پانے کی دعوت دی جاتی ہے کلی کو دیکھ کر آپ کی تشنہ کام روح اپنے مبدۂ نور سے واصل ہونے کے لئے بے تاب ہوجاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں
صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

اسی دور میں اقبال مغربی تمدن سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں۔

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

تہذیبِ حجازی سے شیفتگی بڑھ جاتی ہے۔ مذہب اسلام کی عظمت اور پیغمبر صلعم کی تعلیم سے گرویدگی۔ نظریہ اخوت کی عالم گیری۔ آپ کی سحر آفریں زبان سے نئی معنویت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ باوجود ملتِ اسلامیہ کی پژ یاس حالت کے رجائیت جو آپ کے کلام کا مخصوص عنصر ہے، اس کی ابتدا یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

آپ کا نصب العین اور مقصد حیات صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

حقیقت کی گہرائیاں آپ کے دل پر اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا، بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

پھر آپ کو خواہش ہوتی ہے کہ:۔

جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

# فلسفۂ عجم

سر اقبال نے جو مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے یورپ کے قیام کے زمانہ میں لکھا تھا۔

(THE DEVELOPMENT OF META-PHYSICS IN PERSIA) ارتقائے مابعد الطبیعات عجم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اور یہ کتاب اپنی اہمیت کی وجہ سے میسور یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے فارسی کے نصاب میں داخل ہے۔ ۱۹۳۷ء کے آخر میں جب میں امتحان ایم۔ اے (فارسی) کی تیاری میں مصروف تھی تو پروفیسر شوستری صاحب ایم۔ اے کے ایماء سے میں نے سر اقبال کو ایک عریضہ اس کتاب کی فراہمی کے متعلق لکھا تھا تو انھوں نے جواب میں تحریر فرمایا:
THIS BOOK IS MUCH ANTIQUATED TO BE READ NOW.

آپ کا یہ گرامی نامہ اسوقت بھی میرے پاس ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے ال۔ ال۔ بی نے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کی تقسیم حسب ذیل ہے:۔

حصۂ اوّل

# قبل اسلامی فلسفۂ ایران

باب اوّل۔ ایرانی ثنویت

حصۂ دوم

باب دوم۔ ایران کے نو فلاطونی ارسطا طالیسیں
باب سوم۔ اسلام میں عقلیت کا عروج و زوال
باب چہارم۔ تصوریت اور حقیقت کے مابین تنازع"
باب پنجم۔ تصوف
باب ششم۔ مابعد کا ایرانی تفکر؛

یہاں ہمارے موضوع کے لئے تصوف کا باب اہمیت رکھتا ہے باب پنجم کے پہلے حصے میں تصوف کا ماخذ اور قرآن سے اس کا جواز ثابت کرکے دوسرے حصے میں صوفیانہ مابعد الطبیعات کا ذکر کرتے ہیں۔ مترجم نے علامہ اقبالؒ کی تمہید کے اقتباس میں یہ بھی لکھا ہے :۔

تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹیفک طریقے سے بحث کی ہے۔ اور ذہنی حالات و شرائط کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ جو اس قسم کے واقعہ کو معرض ظہور میں لے آتے ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے برخلاف جو عام طور پر

تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہیں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش
کی ہے کہ تصوف ان مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں
کے باہمی عمل و اثر کا لازمی نتیجہ ہے۔ جو ایک
خوابیدہ روح کو بیدار کرکے زندگی کے اعلیٰ
ترین نصب العین کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

باب پنجم میں ایرانی تصوف کے ماخذ کے متعلق وان
کریمر (VON KROMER) نکل سن (NICHOLSON) اور پروفیسر
بروؤن (BROWN) کے آراء کا ذکر کرکے ان کو غلط فہمی
قرار دیا ہے۔ اور تصوف اسلامی کو ان سیاسی۔ اجتماعی
اور عقلی حالات کا نتیجہ ظاہر کیا ہے۔ جو آٹھویں صدی کے
اختتام اور نویں صدی کے نصف اول کی خصوصیت ہیں
اقبال کے نظریے میں تصوف عقل کی تشفی اور ارادے کی رہنمائی
دونوں کام کرتا ہے۔ جس سے احساس کی مکمل تبدیلی ہو سکتی
ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"با ایں ہمہ تصوف اسلام سے بیگانہ نہیں ہو سکتا اور
کائنات سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا جواز قرآن سے پیش
کرتا ہے۔

پھر انھوں نے قرآن کی ان آیتوں کا ذکر کیا ہے جن کی
رو سے صوفی اپنے خیالات کو قرآن کے نقطۂ نظر سے جائز
قرار دیتے ہیں۔ آخر میں علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔
میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیث

صحیحہ میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے
لیکن وہ عربوں کی خالص علمی ذہانت کی وجہ
سے نشو ونما پاکر بار آور نہ ہو سکے۔ جب ان
کو ممالک غیر میں موزوں حالات میسر آ گئے
تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت میں جلوہ گر
ہوئے۔

اس کے بعد چند ایسی آیات کا ذکر کیا ہے جو صوفی
مفسرین کے عقیدۂ وحدت الوجود کا باعث ہوئے۔ پھر
صوفیوں کی روحانی تربیت کے چار منازل اور نقش
بندیہ کے مراقبے کے طریقوں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس باب کے دوسرے حصّے کی مبحث یعنی صوفیانہ
مابعد الطبیعات میں زیادہ تر صوفیائے کرام کے عقائد
و اقوال کا ذکر ہے۔ خود سر اقبال کے عقائد پر اس سے
کچھ روشنی نہیں پڑتی لہذا بہ خوف طوالت یہ مضمون
نظر انداز کیا جاتا ہے۔ تاہم ان میں سے بعض کا تعلق
کہ ہمارے پیش نظر مضمون سے ہے۔ اس کا ذکر آسان
لفظوں میں اس مقالے کی تمہید میں ہو چکا ہے۔

الغرض یہ کتاب ان کے زمانہ طالب علمی کی یادگار
ہے۔ اسکے بعد آپ کے خیالات اور طرز بیان میں انقلاب عظیم
واقع ہوا۔ اور آپ کا خاص فلسفیانہ تصوف مشرقی روحانیت
اور مغربی عقلیت کے امتزاج سے تشکل ہوا۔

# باب دوم

## دورِ سوم ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کی نظمیں

**تمہید** — سر اقبال کے کلام کا تیسرا دور یورپ کی واپسی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ آپ کے قیامِ یورپ نے آپ کے خیالات کی کایا پلٹ دی۔ پروازِ تخیل نے عالمِ بالا کی سیر کی۔ شاعر کی نگاہِ تیز بیں نے فطرت کی گہرائیوں کا مطالعہ کیا اور اس کے اسرار سے واقفیت حاصل کی۔ تجسس اور استفسارات میں کمی ہوئی۔ رموزِ حکمت و تصوف کے گوہر رولے گئے۔ مسلمانوں کی تباہی اور اُن کی چشم دید کس مپرسی کی حالت نے آپ کی نظموں میں سوز و گداز اور جذبۂ قومی پیدا کر دیا اور آپ کے قلم سے شمع و شاعر شکوہ و جواب شکوہ۔ خضرِ راہ۔ اور طلوعِ اسلام جیسی معرکۃ الآرا نظمیں نکلنے لگیں۔ آپ کا مقصد دورِ دوم کے مقرر کردہ دستور العمل کی اشاعت ہو گیا۔ ملتِ بیضاء کو اپنے اس لائحۂ عمل پر چلنے کی ہدایت کرنے لگے تاکہ اس طرح سے اس کے یاس خیز اور افسردہ دل میں زندگی کی لہر دوڑ جائے اور یہ از سرِ نو زندگی پا سکے۔

جنگِ عظیم کے بعد سے ہی آپ کی نظموں میں واردات

شاعری کی بجائے وعظ و نصیحت کا رنگ جھلکنے لگا۔ کبھی تو اسلاف کے کارنامے یاد دلاکر اور کبھی یورپ کی کورانہ تقلید سے تنفر ظاہر کر کے۔ کبھی قوم کے جمود و سکون کی برائی بیان کر کے اور کبھی قوم کی بہبودی کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگ کر اس افسردہ ملت کو از سر نو شگفتہ دیکھنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ تیسرے دور کی نظمیں وجدان و جوش و فراوانی جذبہ کی آمد کا نتیجہ ہیں جس میں آورد کو کسی طرح کا دخل نہیں۔ آپ کا مذہب عشق ہوجاتا ہے۔ اور حکمت و تصوف کے میل سے خاص قسم کا فلسفہ تصوف متشکل ہوتا ہے۔ اس سوال پر کہ آپ کا تصوف مغرب و مشرق کے حکماء و متصوفین کا کہاں تک رہین منت ہے باب پنجم میں مجملاً بحث کی جائے گی۔

یورپ سے واپسی کے بعد ملت اسلامیہ کی عظمت کے دبدبہ اور تہذیب حجاز کی شیفتگی نے آپ کے دل میں گھر کر آپ کے کلام میں مذہبیت کا عنصر اور زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ تہذیب سے دل برداشتہ ہوگئے۔ ان کی نظروں میں اسلامی روایات کی توقیر بڑھ گئی۔ عالمگیر اخوت کے معاملہ میں وجود افراد کو بے حقیقت سمجھنے لگے۔ خودی اور خود افزائی زندگی کا نصب العین بنگئے۔ رجائیت کو نمایاں جگہ حاصل ہوئی۔ اور خضر راہ۔ طلوع اسلام۔ خطاب بہ جوانان اسلام۔ نوید مسلم۔ جیسی نظمیں آپ کے قلم سے نکلنے لگیں۔ وطنی شاعری ملی ترانوں سے مُبدّل ہوگئی۔

قیام یورپ کا اثر یہ بھی ہوا کہ آپ نے محسوس کیا کہ آپ کی تعلیم جغرافیائی و ملکی حدود سے بالاتر ہونی چاہیے۔ اور نیز یہ کہ اردو زبان آپ کے اسرار و فلسفہ و تصوف کے دقیق خیالات کی حامل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ سے واپسی کے بعد فارسی زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اقبال کے کلام کی زبان میں یہ مسئلہ ایک لحاظ سے اہم ہے۔ اس کے متعلق محقق اردو جناب سر شیخ عبدالقادر صاحب "بانگ درا" کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

> فارسی میں شعر لکھنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب حالات تصوف کے متعلق لکھنے کے لئے جو کتب بینی کی اس کو بھی ضرور اس تغییر مذاق میں دخل ہوگا۔
>
> اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے۔ اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنے آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے۔ مگر بظاہر جس چھوٹے سے واقعہ سے

ان کی فارسی گوئی کی ابتداء ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی۔ اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی شعر بھی کہتے ہیں یا نہیں۔

انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ انھوں نے سوائے ایک آدھا شعر کہنے کے کبھی فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک انکے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پہ لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی وہ مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں۔ جو انھوں نے زبانی مجھے سنائیں۔

ان غزلوں کے کہنے سے انھیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا۔ جس کا انھوں نے اس طرح امتحان نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہو گیا"۔

پس دور سوم میں اقبال نے اردو نظموں کے

علاوہ اسرار خودی۔ رموزِ بے خودی۔ پیامِ مشرق اور زبور عجم لکھیں اور اپنی مخصوص تعلیمات کو فارسی زبان میں نئی خوبی اور روانی کے ساتھ بیان کیا کہ دنیا محوِ حیرت ہو کر رہ گئی۔

اس باب میں اقبال کے دورِ سوم کے اردو اور فارسی کلام اور انکی انگریزی تصنیف پر نظر ڈالی جائیگی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی شائع ہوئیں۔ جن میں اقبال مولانا روم اور شمس تبریز کی دنیائے عشق میں محو ہو جاتے ہیں۔ اور "خان آبادِ حکمت" سے نکل کر" روح پرور حضوری کی طرف صعود کرتے ہیں۔

مثنوی اسرارِ خودی تکمیلِ فرد کے لیئے لائحہ عمل پیش کرتی ہے اور رموزِ بے خودی۔ اسرارِ خودی کے شکوک کے ازالہ کے لیئے لکھی گئی ہے۔ جس میں کل ملتِ اسلامیہ کے لیئے ایک دستور العمل مقرر کیا گیا ہے۔ پیامِ مشرق کی تصنیف کا محرک بقول اقبال جرمن حکیم حیات" گوئٹے" کا دیوان ہے۔ اس میں گوئٹے مغرب کے فقدانِ روحانیت پر ماتم کرتا اور مشرق سے پیامِ روحانیت کا خواہاں ہوتا ہے اقبال اس کتاب میں مغرب کے نام اپنا پیغام بھیجتے ہیں جو عشق و عمل پر مبنی ہے۔

۱۹۱۵ء کے بعد زبورِ عجم اپنی تمام شان و شوکت

سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ جس میں مسئلہ وحدت الوجود پر جدید نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں دنیا کو پیغام بیداری سنایا جاتا ہے۔ اور آزادی کی تلقین کی جاتی ہے۔ تیسرے دور کی تکمیل آپ کی انگریزی کی چھ تقریروں سے ہوتی ہے۔ جس میں فلسفہ کو تصوف کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کے خاتمہ پر اقبال کے خیالات میں پختگی پائی جاتی ہے۔ اور چوتھا دور ۱۹۳۰ء کے بعد ہے، مصلحانہ جاہ و جلال اور پیغمبرانہ شان و شوکت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔

اس دور کا کلام زیادہ تر فارسی زبان میں ہے نکات تصوف کو عام فہم بنانے کی غرض سے فارسی اشعار کو بجنسہٖ نقل کر دینے کے بجائے حتیٰ الامکان آپ کے خیالات کی اردو زبان میں ترجمانی کرنے کی کوشش کیگئی ہے۔

## دورِ سوم کی نظمیں

بلادِ اسلامیہ کی زیارت سے مسلمانوں کی گذشتہ جاہ و حشمت کا نقشہ شاعر کی آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ الفتِ نبویؐ سے بے خود ہو کر یثرب کی سرزمین کی دید کو حج اکبر سے بڑھ کر تصور کرتا ہے۔ روحانی شفاخانہ حجاز میں جاکر فرماتے ہیں:۔

میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

**عشق و محبت** اس زمانہ کی نظموں میں عشق اور محبت کی لذت کو اقبالؒ اپنے خاص رنگ میں ظاہر کرتے ہیں اور عشق پر اعمال کی بنیاد رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں اور عشق کی رسائی اور عقل کی نارسائی کا مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

گو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

**رجائیت** اقبال ابتداء میں قوم کی بے کسی پر بے تاب ہو جاتے تھے لیکن اس زمانے میں رجائیت کا عنصر نمایاں ہوتا جاتا ہے۔

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

مسلم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں، کیوں تو آہ و زاری کرتا ہے۔ کیوں نغمۂ امید تیرے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھ۔

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پہ مجھے

۱۹۱۲ء میں فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت آپ کی امید کو ابھارتی ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فلسفۂ غم۔ آپ کا فلسفۂ غم یہ ہے کہ انسان بغیر غم و الم کے کامل نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا راز کلفتِ غم میں پوشیدہ ہے۔

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

بے تعصبی۔ بے تعصبی متصوفین کا شعار رہی ہے۔ اور اقبال بھی اپنے تحفۂ عقیدت کو گوتم بدھ اور نانک جیسے رہبران قوم و ملت کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ نیز آپ کے ذہن رسا نے مسلمانوں کی جمود و سکون کا ذمہ دار تصوف جدید ٹھہرایا جس میں روحانیت پہ مبالغہ آمیز تاکید کی گئی ہے۔ اور ملتِ اسلامیہ میں جد و جہد کی روح کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرشداں خود بین سے خدا بچائے جو مسلمانوں کو تباہ کر کے اپنا اثر بڑھا رہے ہیں۔

محبت باہمی۔ باہمی محبت میں ہی نوع انسان کی بھلائی مضمر ہے۔

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے

پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

مذہب پرستی۔ مسلمانوں کو مذہب پرستی کی تاکید کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جمعیت کا استحکام مذہب پر منحصر ہے۔

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

فقر اقبال کے لئے فقر کی معنی اشیائے دنیوی سے علیحدگی نہیں بلکہ استغنا اور بے نیازی ہے۔ فرماتے ہیں۔ پہلے سکندر کے مانند خوددار ہوکر شوکت دارای کی ہوس کر۔

روح انسانی۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ انسان کبھی فنا نہیں ہوتا کیونکہ وہ روح جیسی لافانی شے سے مرکب ہے۔ موت ظاہربینوں کے لئے پیام فنا ہے لیکن حقیقت بین موت کے بعد اعلیٰ ترین زندگی کا آغاز ہوتا ہے جہاں مولانا روم کے مانند اقبال ارتقائے انسانی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

**تخیلِ جہنم** آپ کے تخیل میں جہنم ایک تاریک سرد اور سنسان جگہ ہے اور آگ کے شعلے دراصل خود اہلِ دنیا کے لائے ہوئے اور اس جگہ کے لیئے مستعار ہوتے ہیں۔

۱۔ **نظم شمع و شاعر** اس زمانے کی بہترین نظموں میں "شمع و شاعر" ہے، جو انجمن حمایت اسلام۔ لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر پڑھی گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا عبرت انگیز خاکہ ہے۔ شمع و شاعر میں مکالمہ ہے۔ شاعر کی شکایت ہے کہ باوجود اپنی تپشِ پیہم کے کوئی پروانہ اس کے شعلے کے طواف کو نہ آیا۔ شمع جواب دیتی ہے کہ اس کا سوز اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس کے طبعی گداز نے پروانوں کو اس پر نثار ہونے پر مائل کیا۔ لیکن اس کے برعکس شاعر کا سوز و گداز بناوٹی اور نام و نمود کی ہوس ہے۔ اس لیئے اس کا جلنا سوز دروں سے خالی ہے۔ نیز اس کے شعار اور آئین ملت کے شعار میں حدِ فاصل ہے۔ انسان باوجود کعبے کو اپنے پہلو میں رکھنے کے بت خانہ کے لیئے مارا مارا پھرتا ہے۔ اس کا دل عشق سے نا آشنا اور کشمکشِ حیات سے بے بہرہ

ہے۔ در اصل مسلمانوں کی تباہی اُن کے اسلاف کے کارناموں سے بے خبر رہنے کا نتیجہ ہے۔ مگر مایوسی اقبال سے بعید ہے۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

پس مسلم کو چاہئے کہ محبت کر سینے میں مستور رکھے۔ تحقیق و تفتیش چھوڑ کر کلیم کے مانند وادی سینا میں مقیم ہو جائے۔ اس کی خودداری ساقی کا مرہون منت ہونے سے اس کو باز رکھے۔ جدت کا طلبگار ہو۔ اسکا عشق جدید ہو، اسکا صحرا بھی نیا۔ فرماتے ہیں چرخ ستمگار نے اگر مجھ کو عاجز بنا دیا ہے تو دانے کی طرح زمین سے سرسبز ہو کر پھر اٹھا۔ اسلاف کی روش اختیار کر۔ خاموشی کو چھوڑ کر سراپا نالہ بن جا۔ اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہو کیونکہ تو خود ہی دانہ۔ کھیتی۔ باراں اور حاصل ہے۔

"آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے
ناخدا تو، بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
پس وہی قیس۔ لیلیٰ۔ صحرا اور محمل ہے اور وہ

محتاج ساقی کیوں ہو جب کہ خود ہی مینا۔ ساقی اور محفل ہے اے باطل کے غارت گر بے خوف رہ کیونکہ کہ تو ماسوی اللہ

کو جلانے والا ہے۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایّام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

انسان اگر اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جائے تو دیکھے گا کہ گو وہ قطرہ ہے لیکن بحرِ بے پایاں کے پوشیدہ تواء اس کے سینہ میں متلاطم ہیں۔ اس کا قلب عرشِ الٰہی ہے اور اگر وہ چاہے تو ہفت کشور کو فتح کر سکتا ہے۔ پس امید ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

۲۔ شکوہ بانگ درا کی دوسری مشہور نظم "شکوہ" ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کے کارناموں، موجودہ بے حسی اور بے کسی کا نقشہ نہایت ہی درد انگیز لہجہ میں کھینچا گیا ہے۔ اس نظم میں ناز و نیاز، بے باکی و عجز کی دلکش آمیزش ہے۔

۳۔ جواب شکوہ نظم "جواب شکوہ" ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں عہد ماضی کی داستانیں سنا کر قوم کی بیداری آپ کا مطمح نظر ہے۔ صدائے غیبی میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب اور انکی رسوائی کے وجوہات کا بیان ہے۔ پھر یاس جذبۂ امید سے متبدل ہو جاتی ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کہتے ہیں در اصل مذہب سے دوری اور انتشار و عدم اتحاد مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔

قوم سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبہ باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

نہ تو مسلمانوں میں کوئی ہنر باقی ہے اور نہ اپنی ملکیت کی حفاظت کا خیال۔ اسلاف کے کارناموں کو یاد کرو جنھوں نے باطل کو مٹا کر اور انسان کو آزاد کرکے کعبہ کو جبینوں سے بسا دیا۔ اور ہمیشہ قرآن کو اپنے سینوں سے لگایا۔ اس کے برعکس اب مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور امتیاز ذات و فرقہ نے ان کی قوت مخزہ کو منتشر کرکے ان کو راہِ عمل میں گامزن ہونے سے روکا ہے۔ سنتِ نبویؐ کی پیروی کرنی تھی اور مصلحتِ وقت کا اندازہ لگانا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے غیروں کی کورانہ تقلید میں اپنے روایات قدیمہ کو فراموش کردیا نہ تو انکے قلب میں سوز ہے۔ اور نہ روح میں احساس زمانۂ موجودہ میں صرف غرباء ہی آئینِ اسلامی کے پاسبان ہیں۔ دوسروں میں مذہب رسمی صورت میں باقی ہے۔ فلسفہ کا دور دورہ ہے اور امام غزالیؒ کی تعلیم پہ کوئی اعتنا نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے مخصوص خصائل مثل صداقت

حیا اور شجاعت اب ان میں باقی نہ رہی۔ خوفِ مرگ نے ان کو بزدل بنا دیا اور نہ مسلمانوں کا فقر حضرت علیؓ کے مانند ہے اور نہ ان میں دولت عثمانی کی شان باقی ہے۔ اگر تم اپنی گم گشتہ عظمت حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے استعداد پیدا کرو۔ اور اسلاف کے مانند غیور، خود دار۔ اخوت پرست اور سراپا کردار بن جاؤ باوجودیکہ تہذیب جدید، روایات قدیمہ کو جلا رہی ہے لیکن اس آگ سے گلستاں پیدا ہو سکتا ہے۔

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

مسلم کو خطاب کرتے ہیں:۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

جس کو تو اپنی دل آزاری سمجھا ہوا ہے۔ در اصل یہ تیرے ایثار و خود داری کا امتحان ہے۔ تجھ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ تو ذرّے سے بیاباں بنجائے۔ اور تیرا نغمہ موج ہنگامۂ طوفان سے مبدّل ہو۔

قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

عقل اور عشق کی پیہم سے تو ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے

**خضرِ راہ** حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۲ء میں خضرِ راہ پڑھی گئی۔ اس نظم میں زمانۂ حاضرہ پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ خضر کو ساحلِ دریا پر خاموشی و تنہائی میں پاکر رہنمائی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اور اقوامِ عالم کی حالتِ زار کو بیان کرتے ہیں۔ خضر اس کے جواب میں اسرارِ حیات کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ دوڑ دھوپ اور عمل کا نام زندگی ہے۔ الغرض اس نظم میں عملِ پیہم کی عجب دل کش انداز میں ترغیب دی گئی ہے۔

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی

پھر مغربی جمہوری سلطنتوں اور سرمایہ داری کا بیان ہے۔ مسلمانوں کو دستِ سوال دراز کرنے سے باز رکھا گیا ہے۔ اور اتحاد اور احکامِ مذہبی کی پیروی کی تلقین کی گئی ہے۔ اور آخری حصے میں وہی امید کی جھلک پائی جاتی ہے۔

**طلوعِ اسلام** میں فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے اسلاف کا سا قلب و جگر پیدا کیا تو باوجود اس تباہی کے از سرِ نو زندہ ہو جائیں گے۔ اور ان کے عروقِ مردہ میں نئے سرے سے جان پڑ جائے گی۔

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا

ہے

خلیل اللہ کے دریا میں ہونگے پھر گہر پیدا

اے مسلمان، تو خدائے لم یزل کا دست قدرت و زبان ہے۔ مغلوب گماں مت ہو، اور اپنی نیابت الٰہی کا یقین پیدا کر۔ در اصل مسلمان کی منزل چرخ نیلی فام سے بالا تر ہے۔

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

لہذا:-

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اخوت و محبت رمز مسلمانی ہے۔

رنگ و ملت توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

زندگی میں ثبات پیدا کرنے کے لئے ایمان کی استواری شرط ہے۔ ذوق یقین سے انسان غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکتا ہے اور نگاہِ مردِ مومن میں تقدیر کو بدل سکتی ہے۔ آقا و بندہ کی تمیز انسانیت کی تباہی کا باعث ہے۔ یقیں محکم عمل پیہم اور محبت وہ شمشیریں ہیں جن سے کل عالم مفتوح ہو سکتا ہے۔ مغرب کی تہذیب سے کنارہ کش ہو کر عمل سے زندگی کو جنت بنا لو اور اعتماد خود داری کو شعار بناؤ معرفت خودی کو اپنا نصب العین بناؤ۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا

اس دور کی نظموں میں صوفیانہ انداز اور رموز فلسفہ اور زیادہ نمایاں ہیں۔ آپ کو تصوف میراث میں ملا تھا۔ اور اس پر فلسفہ کی تعلیم نے آپ کے ذہن رسا اور موزوں طبع سے مل کر وہ معجز بیانیاں کیں جو ادبیات اردو میں ایک بیش بہا اضافے کا باعث ہوئے۔ آفاق میں حسن حقیقی کی جھلک اور کسی گم گشتہ شے کی ہوس میں روح کی بے تابی کے بیان میں تصوف اور حکمت کے گوناگوں رنگ ملائے گئے۔ متصوفین کی طرح انھوں نے انسان کے نیابت الٰہی کے درجے کی توضیح کی۔ پھر اپنے خاص تصوف کو تصوف عامہ سے ممیز کرنے کے لئے عمل پیہم و جستجو و بے قراری کی تلقین کی اور جمود و سکون کو بُرا جانا۔ اور فلسفۂ خودی اور خود افزائی سے حوصلہ بڑھنے کی کوشش کی۔ فنا کو جوہر انسانی کے خلاف ثابت کیا۔ اور اپنے خاص عقیدہ رجائیت کی بدولت موت کو بھی زندگی جدید کا باعث ٹھہرایا۔

جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے۔ یورپ کی واپسی کے بعد زیادہ تر آپ نے فارسی زبان کو آلہ سخن قرار دیا۔ اور آپ کی اعلیٰ ترین تصانیف دراصل فارسی زبان میں ہیں۔ جن میں تصوف کے دریا بہا دئے گئے ہیں۔

اسرار خودی۔ رموز بے خودی اور جاوید نامۂ اقبالؒ کے تصوف کے متعلق خاص طور پر اہم ہیں۔ اس لئے دوسری تصانیف کی بہ نسبت مذکورہ بالا کتب کا بوضاحت تمام ذکر کیا جائے گا۔

۱۹۱۴ء کے بعد سے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ جنگ عظیم اور مسلمانوں کی تباہی نے آپ کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ آپ کی دور بین نظروں نے دیکھ لیا کہ اگر ملّت بیضا اس وقت بھی خواب غفلت سے بیدار نہ ہو تو اُن کے صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جانے میں کوئی کسر ہی باقی نہ رہیگی

پس اس کے بعد سے آپ کے اشعار میں لفظی خوبیوں کے بجائے معنوی خوبیاں نظر آنے لگیں۔ آپ کے اشعار فلسفہ اور تصوف سے پُر ہوگئے۔ آپ نے اپنا جداگانہ "اُصول خیر" مقرر کرکے اس کی تعلیم عام کرنے کا بیڑا اٹھالیا۔ افلاطونیت جدیدہ اور تصوف حاضرہ کی فقدان عمل کی تعلیم کو مسلمانوں کے لئے زہر ہلاہل سمجھا۔ تاہم آپ نیٹشے کے مانند منکر مذہب نہیں ہوئے بلکہ اپنی تعلیم کی بناء توحید اور رسالت پر رکھی۔ اسلاف کے کارناموں کو یاد دلاکر مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ تہذیب حاضرہ اور تعلیم عجمی آپ کی نظروں میں بے انتہا نفرت انگیز دکھائی دینے لگے۔

شت چاز کی تعلیم کو نمونۂ عمل قرار دیا۔ چھوٹی چھوٹی نظموں کی بجائے آپ کے قلم سے مثنویات اور پیام مشرق اور زبور عجم جیسی شاہ کار کتابیں نکلنے لگیں۔ جن میں فلسفہ اور تصوف کی ایسی آمیزش ہوئی کہ ایک کی تفسیر دوسرے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

یوں تو پہلے ہی سے آپ کی چھوٹی بڑی نظمیں موجود تھیں۔ لیکن آپ کے شاہکار تصوف کے سلسلے کی پہلی کڑیاں اسرار خودی اور رموز بے خودی ہیں۔ اول الذکر نے افراد کے لئے لائحۂ عمل پیش کیا۔ اور آخر الذکر نے ملت اسلامیہ کے رموز حیات کو واضح کیا۔ شیخ اکبر علی اپنے مضمون بعنوان "اقبال اور انکی نظمیں اور پیام" میں کہتے ہیں کہ مثنوی ایک مرکز ہے۔ جس کے اطراف تمام وہ خیالات جو بانگ درا۔ پیام مشرق۔ زبور عجم اور جاوید نامے میں ہیں گھومتے ہیں۔ اور مثنوی شاعر کے خیال کی تمہید ہے۔

# اسرارِ خودی

اسرار خودی اور رموز بے خودی میں اقبالؒ کل اقوام انسانی کے لئے لائحۂ عمل پیش کرتے ہیں۔ اِن مثنویوں میں اگلی سی بے تابی اور اضطرابیت نظر نہیں آتی۔ نصب العین کی تلاش میں آپ کامیاب ہو چکے

ہیں۔ امّتِ بیضاء کی تباہی کی ۔۔۔۔۔۔ داستان بیان کر چکے۔ اب ملّتِ بیضا کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ امید کی شعاعیں آپ کے حرماں خیز دل پر جلوہ گر ہونے لگی ہیں۔ کہتے ہیں ان مثنویات کا ماخذ مولانا رومؒ کا کارنامہ ہے۔ اسرار میں مولانا کا تتبع نمایاں ہے۔ آپ نے مغرب اور مشرق کے فلسفے وتصوف سے گہرے مطالعے کے بعد محسوس کیا کہ متقدمین کا تصوف جس سے پاکیزگیٔ قلب اور مسرتِ روحانی مُراد ہے اور جس کی مثال پیغمبر صلعم کی زندگی میں ملسکتی ہے بہترین ہے لیکن تصوف مروجہ کا بے جا توکل اور جمود و سکون مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔

پس آپ نے اپنے لائحہ عمل میں اس قسم کے تصوف اور مغربی تمدن کے خلاف خوب زہر اگلا ہے۔ دونوں کو آپ حدِ اعتدال سے گذرا ہوا جان کر بُرا سمجھتے ہیں۔ اعتدال اسلام کا اصول زرّیں ہے۔ علوم دینی بھی ہمارے لئے ضروری ہیں۔ اور علوم دنیوی بھی۔ روحانیات کا درجہ بھی مادیات سے بالاتر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اتباع سنتِ نبویؐ اور روایاتِ قدیمہ کی پیروی سے روحانیت کے مدارج طے کرتا ہے۔ اسرار اور رموز میں آپ نے ایک اعتدال پسند معلم کی طرح افراد انسانی کے لئے ایک بیش بہا

مستور الحال زیب قرطاس کیا ہے۔ اسرار خودی کی تمہید میں اپنے متعلق فرماتے ہیں :-

برق ہا خوابیدہ در جانِ من است
کوہ و صحرا بابِ جولانِ من است

اقبالؒ اس مئے کے طلبگار ہیں جو کاوشِ ایام کو دل سے محو کردے اور دیدۂ بیدار کو بیدار تر کردے مولانا رومؒ عشق کی شرابِ ناب کے نوش کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ جس سے وہ خود جل جائیں اور دوسروں کو بھی جلا دیں۔ یہ سُن کر اقبالؒ پر عالم بے خودی طاری ہوتا ہے۔ اور خودی کے اسرار کو علانیہ بیان کرنے لگتے ہیں۔ رموز حیات بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ قطرہ دریا کا ہم پایہ بن جاتا ہے۔

آپ فرمانے لگتے ہیں کہ نظامِ عالم کی اصل خودی ہے۔ اور عالمِ موجودات کی حیات کا انحصار خودی پر ہے خودی کی پائیداری کی مناسبت سے زندگی عطا ہوتی ہے قطرہ بھی اگر اپنی خودی سے آگاہ ہو تو گوہر بنجاتا ہے۔ خودی سے لاعلمی کی وجہ سے شراب ساغر کی منت کش رہتی ہے۔ فطرت کی ہر شے خودی سے سُرخ رو اور بیخودی پر نالاں ہے۔ خودی کی تقویت سے زندگی کی لہر سمندر کے پیکر میں جلوہ افروز ہونے لگتی ہے۔

مقاصد کا تعین خودی کو زندہ رکھتا ہے۔ اور

اور مدعا اور مقاصد زندگی جاوید کا باعث ہوتے ہیں طلب و جستجو بھی شرائط زندگی میں داخل ہیں۔ ان کی اصل آرزو ہے۔ پس آرزو سے دل کو زندہ رکھنا چاہیئے۔

صوفیانہ انداز میں اقبال محبت کو خودی کے پائندہ تر۔ زندہ تر اور سوزندہ تر وتابندہ تر بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عشق پر موجودات کی نشوونما منحصر ہے۔ عشق سے ان میں طلاطم پیدا ہوتا ہے۔ اور سنگ خارا بھی ایک نگہ عشق سے ..... ٹکڑے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مولانا روم کے مانند جو شمس تبریز کی عشق کی آگ میں جلا کرتے تھے شمع عشق کو روشن کر۔ مولانا کے مانند تو بھی کسی مرد کامل کے آستانہ پر بوسہ دے۔ درحقیقت تیرا معشوق تجھ سے دور نہیں۔ تیرے قلب کے اندر پوشیدہ ہے جس کے عشق سے تیرا دل طاقت ور ہو سکتا ہے اور ثریا کا ہمدوش بن سکتا ہے۔ اس عشق کا فیض ہے کہ جو خاک نجد شہرت جاوید کا باعث ہوئی۔ پیغمبر صلعم کا عشق مسلمانوں کی طاقت لاتناہی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ پس بایزید بسطامیؒ کی طرح عشق نبوی میں گرفتار ہو جا۔ اور جذبات حیوانی کو اپنا تابع بنا کر خودی کو پائیدار بنا۔

متصوفین کے مانند اقبال بھی استغنا و خودداری

سی تعلیم دیتے ہیں اور سوال کرنے کی مذمت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں سوال سے خودی کمزور ہوجاتی ہے خراج لینے والے شاہنشاہ بہ سبب احتیاج روبہ صفت بن جاتے ہیں۔ لہذا دوسرے کا رہین منت ہونے سے احتراز کر۔ کیونکہ انسان کی طبع بلند بار احسان کے بوجھ سے پست ہوجاتی ہے۔ اپنا رزق سوائے خدا کے کسی دوسرے سے مت مانگ۔ چرخ کج رفتار سے مصروف پیکار ہو۔ سوال کرکے امّت بیضا کی عزت پر دھبہ مت لگا قابل تحسین وہ شخص ہے جو باوجود تپش پیہم کے ایک جام آب کے لئے خضر کا بھی مرہون منت ہونا گوارہ نہ کرے۔

در تہی دستی شود خود دار تر
بخت او خوابیدہ و او بے دار تر

حباب کے مانند غیرت دار بن جو باوجود سمندر میں رہنے کے دوسرے کے بار احسان سے اپنے جام کو خالی رکھتا ہے۔ جب خودی کو عشق سے استحکام عطا ہو تو اس کا زور خدا کا زور بنجاتا ہے اور قواء فطرت اس کے تصرف میں آجاتے ہیں۔ وہ اپنی انگلی سے چاند کو شق کر سکتا ہے۔

سر اقبال بو علی قلندرؒ کے ایک عاشق زار کی حکایت بیان کرتے ہیں۔ جب یہ بازار جا رہا تھا عامل شہر کے ایک

چوب دار نے راستہ دینے کے لیئے اس کے سر پر ایک چوب ماری۔ حضرت بو علیؒ نے بادشاہ وقت کے حضور میں اس عامل کی حرکت بیجا کی شکایت کی۔ اور اسی خط میں بادشاہ سے درخواست کی کہ مجرم کو سزائے واجبی دی جائے۔ سلطان اس خط کو پڑھکر لرز گیا اور حکم دیا کہ اس عامل کو پا بہ زنجیر لایا جائے۔ اور یہ قلندر سے معافی کا خواستگار ہو۔ درویشوں اور عاشقانِ الٰہی کا رتبہ سلاطین وقت سے بھی بالاتر ہے۔ ان کو آزار پہنچانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔

نفی خودی کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ عقیدہ اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہے جو در پردہ اقوام غالب کے اخلاق کو کمزور بنانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک جنگل میں گوسفندوں کا گلہ جب شیر کے ظلم وستم سے تنگ آگیا تو ان میں سے ایک ہوشیار گوسفند نے ایک واعظ کے بھیس میں شیروں کو نفی خودی اور گوشہ گیری اور نفس کشی کی تعلیم دینے کا بیڑا اٹھایا۔ شیر اس کے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور بتدریج اس کے قواء فطری ضعیف ہو جاتے ہیں۔ بہادری کا جوہر فنا ہو جاتا ہے۔ اور پست ہمتی کی وجہ سے صدہا امراض اخلاقی مثل کوتاہ نظری۔ تنگ دلی۔ اور کمینگی فطرت پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اور شیر بوجہ کوتہ فہمی اپنی ان جسمانی و روحانی قوتوں کے زوال کا نام تہذیب رکھتا ہے۔

افلاطون نے انسانوں کو گوسفندی کی تعلیم دی ہے اور یہ دنیائے تخیل میں گم ہوکر زندگی کے راز کو موت میں پوشیدہ سمجھتا ہے۔ تصوف مروجہ نے فلسفہ افلاطونی کی پیروی میں اس دنیائے اسباب کو سراب محض تصور کیا ہے۔ پس بود کو نابود کہنا اور اعیان ثابتہ پر یقین کرنا قوموں کے لیئے زہر آلود ثابت ہوا۔ اور ان کے دلوں سے ذوق عمل جاتا رہا۔ افراد و اقوام کی زندگی کا دار و مدار استحکام خودی اور عمل پیہم پر ہے

فرماتے ہیں خودی کی تربیت کے تین درجے ہیں

(۱) اطاعت (۲) ضبط نفس (۳) نیابت الہٰی۔

شتر باوجود کم خور اور کم خواب ہونے کے محنت پیشہ اور ادائے فرائض میں مصروف رہتا ہے۔ تم کو بھی چاہئے کہ احکام الہٰی کی اطاعت کو اپنا شعار بناکر ارادۂ خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ لیکن اس کو جبر مت سمجھو۔ کیونکہ اس میں اختیار انسانی بھی مضمر ہے۔ سنت نبوی کی پیروی اور احکام الہٰی کی اطاعت اس منزل کی خصوصیت ہے۔

ضبط نفس دوسری منزل کی خصوصیت ہے۔ نفس ایک خود پرست و خود سر شتر کے مانند ہے۔ اگر ہم نے زمام نفس کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا تو خزف گوہر بن سکتا ہے۔ جو شخص نفس پر حکومت نہیں کر سکتا دوسروں

کا محکوم بنجاتا ہے۔ فی زمانہ خوفِ خدا کی جگہ خوفِ مخلوق نے لے لی ہے۔ اس کا مداوا صرف عصائے لا الٰہ سے ہوسکتا ہے۔ حق پرست ماسوی اللہ سے مرعوب نہیں ہوتا نماز پاکیزگیٔ اخلاق کا ذریعہ ہے۔ اور روزہ تن آسانی اور تن پروری کے خلاف ہتھیار ہے۔ حج وطن کی قید سے آزاد کرکے کل افراد کو ملت کے رشتے میں منسلک کردیتا ہے۔ زکوٰۃ سے اخوت و مساوات اور اشیائے دنیاوی سے بے اعتنائی مقصود ہے۔ پس کل ارکان اسلام خوف ماسوی اللہ کو زائل کرتے اور خودی کو مستحکم کرتے ہیں۔ انسان اپنے نفس پر قابو پاکر خوف ماسوی اللہ سے دور ہو سکتا ہے۔

ضبطِ نفسی کے بعد نیابت الٰہی کا درجہ ہے۔ نائب حق کل عناصر پر حکمراں ہوگا۔ اور دنیا کی جان اور رموز جزو کل سے باخبر ہوگا۔ دنیا میں انقلابِ عظیم برپا کردے گا اور ہر ناقص شے کو کامل بنانے کی صلاحیت اس میں ہوگی۔ اور تمام دنیا اس کے آگے سر بسجود ہوگی۔

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارہ سینائے او

وہ زندگی کی تازہ تفسیر بیان کریگا۔ ہمیں اپنے سوار اشہب دوراں کا انتظار ہے۔ تاکہ اقوام کی شورشوں کو خاموش کرکے ان کو اخوت و محبت کا جام صہبا پلا دے۔

در شرح اسرار اسمائے علیؓ مرتضےٰ فرماتے ہیں حضرت

کی زندگی فقر و عمل کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ حق کی پاسبانی میں مردانہ وار تلوار اٹھاتے ہیں اور آپ کا فقر و استغنے اور خودداری کا مرادف ہے۔ اس قسم کی قناعت میں ناتوانی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ناتوانی خوف اور جھوٹ سے مرکب ہوتی ہے۔ صاحبِ عقل سلیم کو ایسے دہوکہ باز اشخاص سے جو رحم ، نرمی و انکسار کے پردے میں اپنے اوصاف ذمیمہ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دور رہنا چاہیئے۔ توانائی اور صداقت لازم و ملزوم ہیں۔ صداقت سے خودداری کو تقویت نصیب ہوتی ہے۔ چاہیئے کہ خود کو دونوں عالم سے بہتر شمار کریں اور اسرار حیات سے آگاہی پانے کے خواہاں ہوں اور غیر اللہ کے خوف کو دل سے دور کردیں اقبالؒ مولانا رومؒ کی طرح حکایات کے ضمن میں فلسفۂ اخلاق و تصوف کو بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں مرو کا ایک باشندہ حضرت سید محمد مخدوم علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو آکر ستم اعدا کی فریاد کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ میں دشمنوں کے ہجوم میں محصور ہوں۔ لیشد مجھے ان کے درمیان زندگی بسر کرنا سکھائیے۔۔ پیر دانا جواب دیتے ہیں اعداء کے خوف سے فارغ ہو تاکہ تیری قوتِ عمل جلہ دار ہو جائے۔

اگر پتھر بھی خود کو شیشہ سمجھ لے تو اس میں خاصیت شکست پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کوئی مسافر خود کو ناتوان

سمجھے تو اپنی جان رہزنوں کے سپرد کردیگا۔ خود کو کیوں آب و گل معجونِ محض سمجھا ہوا ہے۔ اپنی روح کے جوہر سے شعلۂ طور پیدا کر۔

در اصل تیرا دشمن تیرا دوست ہے۔ جس کی وجہ سے تو سرگرم کار ہوتا ہے۔ اور تیری خودی کو حرکت میں لانے کا وہی ذریعہ ہوتا ہے۔ جب تو اپنی خودی کو پائیدار بنالے گا تو دنیا کو زیر و زبر کرسکتا ہے اور زندہ جاوید بن سکتا ہے۔ الماس کا ٹکڑا حفظ خودی کی بدولت ایک طائر تشنہ کام کا شکار نہیں ہوا۔ لیکن قطرۂ شبنم بوجۂ کمزوریٔ طائر تشنہ کی پیاس رفع کرنے کے کام آجاتا ہے۔ انسان اگر الماس کے مانند حفظ خودی کرے تو زندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے۔ اگر شبنم کے مانند نرم ہو تو دوسری خودی اس کو فنا کرکے اپنی خودی کو مستحکم کرلے گی۔

غافل از حفظ خودی یک دم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو
پختہ صورت صورتِ کہسار باش
حاصل صد ابر دریا بار باش

الماس اور زغال (کوئلہ) میں مکالمہ ہوتا ہے۔ الماس کہتا ہے کہ ایک تیرہ خاک بھی پختگی اور ثبات کی بدولت ہیرا بن سکتا ہے۔ دیکھ میرا جسم پختگی کی بدولت ہی سراپا نور ہوا تو بھی خوف اور غم اور وسواس سے آزاد ہوجائے تو پتھر کے

مانند سخت ہوکر الماس بن سکتا ہے۔

شیخ و برہمن کی حکایات میں گنگا اور ہمالہ کا مکالمہ ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روایات ملیّہ کی پیروی سے قوم زندہ رہ سکتی ہے۔

بنارس کا ایک محترم برہمن باوجود ریاضت کے وصال باری سے محروم رہ کر ایک دن شیخ کامل کے پاس جاتا ہے۔ شیخ کہتے ہیں، اے صحرانشین اور صاحب تخیل شخص اپنے آبا و اجداد کی روش سے بے اعتنائی مت کر۔

من نگویم از بتاں بیزار شو
کافری شائستۂ زنار شو
تو کہ ہم در کافری کامل نہی
در خور طوف حرم دل نہی
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آذر من ز ابراہیم دور

گنگا ہمالیہ کو اس کے طاقت رفتار سے محروم ہونے پر طعن کرتی ہے۔ ہمالیہ جواب میں کہتا ہے کہ۔ تیرے مانند سو دریا میرے سینے میں میری استقامت و خودی کے باعث سوئے ہیں۔ تو اپنی ہستی کو سمندر کے نذر کرتی ہے۔ لیکن میں اپنی جگہ پر قائم ہوں۔

ہیں نے خودی اور سوز پیہم کی بنا پر لعل و الماس و گوہر کو جمع کر رکھا ہے۔ پس مسلمان کی زندگی کا مقصد کلمۃ اللہ

کا اعلان ہے۔ اور وہ جہاد جس کی بنا تسخیر ممالک پر ہو مذہب اسلام میں حرام ہے۔ عشق و محبت مسلمانوں کے لیئے ضروری ہے اگر مسلم عاشق خدا نہ ہو تو وہ کافر ہے۔

پس قال کو چھوڑ کر حال میں مصروف ہو جاؤ۔ قبائے خسروی کے زیب تن کرنے کے باوجود درویشانہ طرز زندگی اختیار کرو۔ تمھاری چشم بصیرت وا اور خدا اندیش ہو۔ اور عمل کا منتہا قربت الہٰی سمجھو تاکہ جلالِ الہٰی کی شان تم میں پیدا ہو جائے پھر اقبالؒ مولانا رومؒ کا پیغام سناتے ہیں۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ شمس تبریز حضرت شیخ کمال الدینؒ جندیؒ کے ارشاد کے بموجب ملا جلالؒ کے مکتب میں گئے۔ جہاں ملا جلالؒ افلاطون و ارسطو کے فلسفہ کی تعلیم دے رہے تھے۔ شمس تبریزؒ کے استفسار پر انھوں نے کہا کہ یہ قال (یعنی فلسفہ) تمہاری فہم سے بالاتر ہے یہ سُن کر شمس تبریزؒ کی نگاہ سے ایک ایسا شعلہ نکلا کہ جس نے ان تمام فلسفے کی کتابوں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ ملا کے استفسار پر شمس تبریز کہتے ہیں۔ ہمارا حال تیرے فکر و خیال سے بالاتر ہے تیرا فلسفہ سرد اور ہمارا دل پُر سوز ہے۔ مسلمان کا علم سوز دل سے کامل تر ہو جاتا ہے۔ سوز عشق کی توقع تعلیم جدیدہ سے مت رکھو۔ کافرانہ پیالے سے اس کیف حقیقی کی امید

مت رکھ۔ اقبالؒ فرماتے ہیں میں نے تہذیب حاضرہ کے نام نہاد گلستاں سے چھوٹ کر شاخ طوبیٰ پہ آشیانہ بنالیا ہے

دانش حاضر حجابِ اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است

تو نے اپنے شمشاد جیسے خوب صورت قد و قامت کو نہ پہچان کر دوسرے کے سرو کو اگایا ہے۔ تو نے نئے کے مانند اپنے دل کو خودی سے تہی کر کے دوسرے کی سریلی آواز پر فریفتہ ہے۔ تیرا دل لا الٰہ کے نقش سے بے گانہ ہے۔ اور ہوس کے بتوں کا بت خانہ بنا ہوا ہے۔ دراصل تیری بربادی کا ذریعہ واعظ متصوفین حاضرہ اور منصب پرست اشخاص ہیں۔ خودی کے رازوں کے بیان کرنے کے بعد اقبالؒ ایک موثر دعا پر اس کتاب کو ختم کرتے ہیں۔

باز از ما خواہ ننگ و نام را
پختہ تر کن عاشقانِ خام را
چشم بے خواب و دل بے تاب دہ
باز ما را فطرت سیماب را
ما پریشاں در جہاں چوں اختریم
ہم دم و بے گانہ از یک دیگریم
باز ما را بر ہمہ خدمت گذار
کار خود با عاشقاں خود سپار
عشق را از شغل لا آگاہ کن
آشنائے رمز الا اللہ کن

# رموزِ بے خودی

آپ کی دوسری مثنوی رموزِ بے خودی ملّتِ اسلامیہ کے حیات کے اسرار کی توضیح کرتی ہے۔ سر اقبال اس کے مختصر دیباچہ میں اس کی تصنیف کی غرض یوں بیان کرتے ہیں جس طرح کہ افراد کی خودی ذوق و عشق اور عمل سے مستحکم ہوتی ہے۔ اس طرح اقوام کی خودی کے استحکام کے بھی بعض ذرائع ہیں جن کا بیان رموزِ بے خودی میں کیا گیا ہے۔

جس طرح قوتِ حافظہ انفرادی خودی کی استقامت کا ذریعہ ہوتی ہے قومی تاریخ کی حفاظت ملّت کی خودی کو مستحکم کرتی ہے۔ گو کہ سر اقبال کا روئے سخن کل افراد انسانی سے ہے۔ لیکن آپ نے اقوام مختلفہ سے ملّت اسلامیہ کو بطور مثال دیگر اس کی خودی اور استحکام کے متعلق اس کتاب میں ایک جامع بحث کی ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ قومی خودی کے لئے افراد کو چاہیئے کہ اپنے اعمال کے تناقض و تباین کو دور کر دیں۔ تاکہ ان میں سے ہر ایک کی شخصیت قومی خودی کے استحکام میں مدد دے۔ تمہید میں فرد اور ملت کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرد کے لئے جماعت سے ملا رہنا باعث رحمت ہے۔ اور اس کے قواء ملت میں رہنے سے کامل ہو جاتے ہیں۔

فرد ملت ایک دوسرے کے لئے ایک آئینہ کی طرح ہیں ایک کا عکس دوسرے میں نظر آتا ہے۔ فرد ملت کی وجہ سے معزز ہوتا ہے۔ اور ملت بوجہ فرد کے مرتب اور منظم ہوتی ہے۔ فرد ایک قطرے کی طرح ہے، جو جماعت میں گم ہو کر سمندر کے مانند وسیع ہو جاتا ہے۔ ملت فرد کے دل میں ذوق ترقی کو ابھارتی ہے گویا کہ اس کی کل ہستی قوم کی بہبودی میں نہاں ہو جاتی ہے۔ اور اس کی زبان قوم کی زبان بن جاتی ہے۔ اسلاف کے نقش پا اس کے رہنما ہوتے ہیں۔

لیکن جاننا چاہیے کہ انسان کی خودی قوم کی محبت اور اس میں جذب ہونے کی وجہ سے زائل نہیں ہوتی۔ بلکہ پختہ تر ہو جاتی ہے۔ اس کی انفرادی خودی جماعت میں مل کر مستحکم ہوتی ہے۔ اور کثرت اس کی وحدت میں جذب ہو کر سراپا وحدت بن جاتی ہے۔

ایک فرد واحد اپنے مقاصد کی ادائی سے غافل رہتا ہے اور اس کی قوت عمل منتشر ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں افراد کے تعاون سے ملت متشکل ہوتی ہے۔ اور نبوت اس کی تربیت کرتی ہے۔ تمام افراد مل کر ایک رشتہ میں منسلک ہو کر زندگی میں نبرد آزما ہوتے ہیں۔ افراد کا تعاون عمل ایک صاحب دل کے ذریعے ممکن ہے جو افراد کی کثرت کو مٹا کر وحدت پیدا کرتا ہے۔

ملت اسلامیہ کی اساس توحید اور رسالت پر ہے ۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لائے ۔ اس کے پہلے ہی جز میں اللہ کی توحید اور دوسرے حصہ میں پیغمبر صلعم کی رسالت کا بیان ہے ۔ توحید ہی قوم کو اپنے اسرار سے آگاہ کر سکتی ہے ، اور اس کی قوت اور زور کا باعث ہوتی ہے ۔ اور توحید ہی دین اور آئین اور حکمت ہے ۔

جس وقت انسان یقین کرتا ہے کہ سوائے خدائے واحد کے کوئی قابل پرستش نہیں تو ایک نصب العین معین کر لیتا ہے اور اسکی طرف تیزی سے ترقی کرتا جاتا ہے ۔ خوف و خطر کو چھوڑ کر سرگرم عمل بن جاتا ہے ۔ لا الٰہ الا اللہ ملت بیضا کو تشکل کرتا ہے ۔ اور توحید پر ایمان لانا چونکہ ہر فرد ملت کے لئے ضروری ہے ۔

لہذا ان میں ایک رنگی پیدا ہوتی ہے ۔ کل افراد ملت کا ایک مقصد اور ایک ہی خیال اور ایک ہی مدعا ہوتا ہے مسلمانوں کا اتحاد ، حسب و نسب کی وابستگی پر نہیں بلکہ ایک عقیدہ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہے ۔ سب مل کر کسی نادیدہ شئے پر ایمان لاتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے وہ سب ایک خیال ایک مقصد ، ایک زبان ایک دل اور ایک جان ہو جاتے ہیں ۔

سر اقبال فرماتے ہیں مایوسی ۔ ملالی اور خوف کل برائیوں کا باعث اور سلسلۂ حیات کو منقطع کرنے والے ہیں ۔

اس کا تدارک صرف عقیدہ توحید سے ہو سکتا ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کا خاتمہ باعث مرگ اور لا تقنطوا من رحمۃ اللہ (اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو) پر ایمان لانا زندگی کی پائیداری کا ذریعہ ہوتا ہے۔

مایوسی۔ رنج و غم باعث قطع حیات ہیں۔ چاہیئے کہ نبی کی اس تعلیم کو "ملال مت کرو" پیش نظر رکھ کر تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنائیں۔ کم و بیش کے خیال کو چھوڑ کر رنج و حزن سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اور ایمان کو مضبوط کرکے خوف ماسوی اللہ کو دل سے دور کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ یہ خوف عمل کے لیئے سد راہ ہوتا ہے۔ اور زندگی کو برباد کرتا ہے اور دشمن ہمیں خوف زدہ دیکھ کر ہماری بربادی کے درپے ہوجاتے ہیں۔

خوشامد۔ مکاری۔ کینہ۔ جھوٹ۔ خوف برائیوں کی جڑ ہیں۔ اور ہم غیر خدا سے خوف کریں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم سوا خدا کے اور کسی ہستی پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ شرک ہے۔ شیر اور شہنشاہ عالمگیر کی حکایت ملاحظہ فرمائیے۔ عالم گیر بادشاہ عاشقِ توحید ایک مرتبہ جنگل کی سیر کو گیئے۔ علی الصباح مصروف نماز تھے۔ ایک خوفناک شیر نے آپ پر حملہ کیا اور آپ نے خنجر نکال کر اس کو مار ڈالا اور پھر نماز کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب تو درگاہ ایزدی میں وہ عجز و نیاز تھا اور دوسرے لہجے میں وہ قوت و جلال

عشق را آتش زن اندیشہ کن
روبہ حق باشی و شیری پیشہ کن

**رسالت** رسالت پر ایمان لانا اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ جس سے افراد متعلقہ ایک رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ اور اس سلسلے کی ایک کڑی دوسری کڑی سے مضبوطی سے پیوست ہوجاتی ہے۔

رسولِ خدا کی رسالت پر ایمان لاکر۔ ایک ملتِ واحد بن کر تمام دنیا کو مسلمان پیامِ رحمت سنا رہے ہیں آپ کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دینا ہمارے انتشار اور موت کا باعث ہوگا۔ افراد کی کثرت کی حیات وحدت قومی میں مضمر ہے۔ افرادِ ملت واحد میں جذب ہوکر زندگیٔ جاوید پاتے ہیں۔ پیغمبر صلعم خاتم النبیین اور مسلمان خاتم اقوام ہوئے۔ اس طرح سے خدانے ہر نبوت کے دعوی کذب کا خاتمہ کرکے مسلمانوں کو ایک شیرازہ میں باندھ دیا۔ توحید کی پرستار قوم عاشق مصطفےٰ بھی ہوتی ہے

**مساوات** عقاید اخوت و مساوات اس کے دل میں جاگزین ہوتے ہیں۔ اور وہ وعدہ جس کو انسان نے روزِ ازل میں خدائے واحد سے کیا تھا پختہ تر ہوجاتا ہے۔ اور خود انسان احکام الٰہی کی پیروی میں ثابت قدم ہوجاتا ہے۔

فرماتے ہیں ایک مرتبہ جنگ میں یزدجرد کے ایک تجربہ کار لیکن مکار سپہ سالار کو مسلمانوں نے گرفتار کرلیا

ایک دوسرے مسلمان نے جو اس کے نام و نشان سے بے خبر تھا اور اس کو پناہ کا وعدہ دے دیا۔ جب ساسانیوں کی دولت کا آفتاب غروب ہو چکا تو معلوم ہوا کہ وہ سپہ سالار جابان نامی تھا۔ جس کا قتل کیا جانا مصلحتِ وقت تھا لیکن ابوعبیدہ مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالار نے اس کو محض اس بناء پر چھوڑ دیا کہ ایک مردِ ملت نے اس کو وعدہ پناہ دیا تھا۔ اور ایک فرد کے وعدہ کا لحاظ دوسرے افراد ملت پر لازمی ہے۔ لہذا اس نے کہا کہ جابان کا خون مسلمانوں کی تیغ پر حرام ہے۔

سلطان مراد اور معمار کی حکایت مساوات اسلامی کی زندہ دلیل ہے۔ ایک معمار نے سلطان مراد کے حکم سے ایک مسجد تعمیر کی جو سلطان کو ناپسند ہوئی۔ اور حکم شاہی سے معمار کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے۔ معمار نے قاضی کے سامنے جاکر داد طلب کی۔

شاہ مراد کو عدالت میں حاضر کیا گیا اور شاہنشاہ والا شان نے ندامت سے اقرار جرم کیا۔ حکم شرع کی رو سے بطور قصاص قاضی نے سلطان کے ہاتھ کاٹ دیئے جانے کا حکم سنایا بعدہٗ بادشاہ کے آستین سے ہاتھ نکالنے پر مدعی نے اللہ کے قصور کو بخش دیا۔ لیکن قاضی کا فیصلہ اور سلطان کی سزا پانے پر آمادگی مساوات اسلامی کی یادگار چھوڑ گئے۔

پیش قرآں بندۂ قرآں یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

## آزادی

حادثۂ کربلا میں حریتِ اسلامی کے جوش کو ملاحظہ کیجیئے۔ اور عشقِ حسینؑ کا جائزہ لیجیۓ۔ عشق عقل کی طرح اسباب و علل میں گم کردہ راہ نہیں۔ عمل اس کی صفت ہے۔ عقل کا سرمایہ خوف و رشک۔ اور عقل کی پونجی عزم و یقین ہے۔ عقل روحانیت کو برباد کر کے مادیات کی تعمیر کرتی ہے اور عشق مادیات کو تباہ کر کے روحانیت کو آباد کرتا ہے۔ عشق عقل کے مانند "چوں و چند" میں گرفتار نہیں ہوتا

حضرت امام حسینؑ کے عشق نے حق کو فتح یاب کیا اور باطل کو شکست دی۔ استبداد کی جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ اور آپ نے ماسوی اللہ کے خوف کو دل سے دور کر کے صداقت پہ قربان ہوکر آئندہ نسل کے لئے نمونہ چھوڑ دیا۔

آپ کا عزم پہاڑ کی طرح استوار اور پائیدار رہا اور آپ کی تیغِ حرمت دین کی پاسبانی میں میان سے باہر آئی۔ آپ کا مقصد حفظِ آئینِ پیغمبریؐ رہا۔ اور آپ نے اپنے لہو سے ملتِ خوابیدہ کو بیدار کر دیا۔ چاہیئے کہ عشق میں استوار رہ کر بے خوف و خطر اشاعت حق کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے دریغ نہ کریں۔

## جذبۂ وطن کا وسیع مفہوم

اقبال فرماتے ہیں۔ جس ملت کی اساس توحید و رسالت پر ہو وہ قید مکان سے آزاد ہوجاتی ہے۔ ہمارا

قلب، ہند، روم اور شام کے رہنے سے محدود نہیں ہوتا۔ ہماری مسجد کل روئے زمین ہے۔ ہجرت نبوی کے یہ معنی ہیں کہ تنگی سے نکل جاؤ اور شبنم کو چھوڑ کر سمندر تسخیر کر لو

پس اے مسلمانو! گل کو چھوڑ کر گلستان کی تلاش کرو چھوٹے سے نقصان کو ایک سراپا فائدے کے لئے قبول کر لو کل روئے زمین کی تسخیر پر آمادہ ہو جاؤ۔ مقام سے آزاد ہو کر ماہی کی طرح کل سمندر یعنی دنیا کو اپنا مکان بنا لو۔ قید حیات سے آزاد ہو کر آسمان کی طرح شش جہت میں آباد ہونا سیکھو۔

قابلِ ملامت ہیں وہ لوگ جو حب وطنی کے جوش میں اخوت انسانی کو ترک کرتے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ ملتِ اسلامیہ قید زمان سے آزاد ہے۔ اور اسی ملت کی زندگی جاوید کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔ گو کہ افراد کے باہمی تعاون سے ملت قائم ہوتی ہے۔ لیکن فرد اور ملت کے شرائط حیات و ممات جدا جدا ہیں فرد کا وجود ایک مشتِ خاک سے ہوتا ہے۔ اور ملت ایک صاحبِ دل کی کوششوں سے تشکل ہوتی ہے۔

فرد کی زندگی چند سالہ اور قوم کی زندگی ہزار سالہ ہوتی ہے۔ انسان کی زندگی جان و تن کے ملاپ سے، اور قوم کی زندگی ناموس کہن کی حفاظت سے ہوتی ہے۔ انسان کی موت چشمۂ حیات کے خشک ہونے سے اور قوم کی موت مقصود حیات کے ترک کرنے سے واقع ہوتی ہے لیکن ملت

اسلامیہ کا چراغ کبھی گل نہ ہوگا۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کے مانند آگ نمرود بھی ان پر گلزار ہوجائے گی۔

## کلام اللہ کا درجہ

نظامِ ملت کے لئے ایک اصول ہونا لازمی ہے اور ملتِ محمدیہ کا آئین قرآن مجید ہے۔ جیسا کہ پھول کی پتیاں خاص آئین سے بندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور جیسا کہ پھولوں کی خاص ترکیب گلدستہ بنا دیتی ہے۔ قرآن مجید تبدیلی شک اور تاویل سے آزاد اور حکمتِ قدیم کا زندہ نمونہ اور آئینِ ملت اسلامیہ ہے۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

گو کہ اجتہاد ضروری ہے۔ لیکن جو اجتہاد کسی قوم کے دور انحطاط میں ظاہر ہو۔ ضرر رساں ہے۔ اس دور میں اسلاف کی پیروی ہی راہ راست و راہِ یقیں ہے۔ عہد حاضر میں مسلمانوں میں نہ تو اسلاف کے مانند جوش ہے اور نہ اجتہاد۔ لہذا

## اجتہاد

اس زمانے میں احکامِ قرآنی اور پیروی اسلاف کو مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ فرماتے ہیں کہ شریعت کی تاویل بھی مناسب نہیں۔ ایمان کا پہلا زینہ شرع ہے اور شارع کا نسخہ یہ ہے کہ عمل سے خستہ استعداد اور کوہ سا کے مانند پختہ ہوسکتی ہے۔ شریعت کا مقصد

پتھر کو آئینہ بنا سکتا ہے۔ اور لوہے سے زنگ دُور کر سکتا ہے۔ ہم شعارِ پیغمبری سے بے اعتنا ہو کر زندگی جاوید سے دستبردار ہو گئے ہیں۔

## توکل و قناعت کی مذمت

فرماتے ہیں۔ ہمارہ وہ عزم کہاں ہے جس سے ہم کوہ کو بھی کاہ سمجھا کرتے تھے۔ توکل کی وجہ سے ہم بے دست و پا ہو گئے اور قناعت نے ہم سے جد و جہد کو چھین لیا اور کشکول گدائی پر ہم ناز کرنے لگے۔ شیخ احمد رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ عجمی خیالات سے پرہیز کرو۔ ان کے افکار تو گردوں کے اس پار پہنچ گئے۔ لیکن دین نبوی کے شعار کو انھوں نے بھلا دیا ہے۔ رہبری کے لیے خاکِ عرب کی طرف رجوع کرو اور عجمیوں کے عقاید ترک کرو۔ اور قناعت سے محترز رہو۔

سر اقبال اپنے عہد طفولیت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ آپ نے جب ایک سائل کے سر پر چوب ماری تو آپ کے والد ماجد فرط غضب میں آپ کو لعنت و ملامت کرتے ہیں اور اخلاق مصطفےٰ کی پیروی کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

بلبل استی در چمن پرواز کن
نغمۂ باہم نوایاں ساز کن
جذبہ پیدا کن ز اندر خون خویش
پا منہ بیروں ز پیرامون خویش

طینت پاک مسلمان گوہر است
آب و تابش از یم پیغمبر است
در جہاں روشن تر از خورشید شو
صاحب تابانیٔ جاوید شو

**بیت الحرام** ملتِ اسلامیہ کا مرکز بیت الحرام ہے یہی ہمارا راز حیات ہے۔ اور راز ولسا ہے جس کو ہم جان شیریں کی طرح سینے میں پرورش کرتے ہیں۔ قوم کی زندگی جمعیت سے ہے۔ اور بیت الحرام میں مسلمانوں کی جمعیت ہوتی ہے۔ یہودیوں نے اپنے مرکز کو چھوڑ کر اپنے رشتۂ جمعیت کو توڑ ڈالا جو ان کی تباہی کا باعث ہوا۔ پس

پیرہن را جامہ احرام کن
صبح پیدا از غبارِ شام کن
مثلِ آبا غرق اندر سجدہ شو
آں چناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو

نصب العین علیہ سے استحکام میں جمعیت، حقیقی کا راز مضمر ہے اور امت بیضا کا نصب العین توحید کی حفاظت اور اشاعت ہے۔

**بقائے حیات** زندگی کی بقا مدعا اور آرزو سے ہے۔ اگر زندگی کا کوئی مقصد معین نہ ہو تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ہمارے

ہمارے رگوں کی خون کی گردش حصول مقصد کی سعی سے تیز تر ہوتی ہے۔ مدعا ہمت کو بڑھاتا اور انسان کو سعی پر مائل کرتا ہے۔ پس تخیل مقصد میں محو رہنا چاہیئے۔ جاننا چاہیئے کہ کائنات کی ابتداء اور انجام توحید پر مبنی ہے۔ توحید کے زور سے چرخ گردش کرتا ہے۔ اور اس سے آفتاب کو استقامت اور روشنی میسر ہوتی ہے۔ اس کی نسیم سے خاک پھول بن جاتی ہے۔ اور ایک ناچیز مشت پر کی ہستی بلبل کا نام حاصل کرلیتی ہے۔ تکبیر میں مسلمان کی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ مسلمان کا نصب العین لا إلٰہ الا اللّٰہ اور توحید کی اشاعت اور حفاظت ہے۔

جب تک دنیا کے ہر کونے سے بانگ توحید بلند نہ ہو مسلمان کو آرام نہ لینا چاہیئے۔ کتاب حق کی اتباع میں میدان میں تیز تر دوڑو۔ ملک و نسب کے نام سے مادیت کی جستجو میں انانیت کو گوسفندوں کی طرح برباد کرنے والوں کو تباہ کردو اور ایام حاضرہ کی تاریکی کو جلوہ حق کی روشنی سے مبدل بنادو۔ نظام عالم کی تسخیر پہ کمر بستہ ہو جاؤ۔ غائب کے تخیل میں حاضر سے یہ سرپیکار ہو جاؤ حاضر کی چیزیں غائب کی تشریح کرتی ہیں اور غائب کی فتح کے لیئے بہ حیثیت دیباچے کے ہوتی ہیں۔

ماسوی اللہ کو اپنے زیر فرمان بنادو۔ جس نے اس

دنیائے محسوسات پر قبضہ کرلیا۔ گویا اس نے ایک ذرہ سے ایک دنیا تعمیر کرلی۔ کوہ اور صحرا اور دشت اور دریا۔ بحر اور بر سے تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ عالمِ اسباب بے کار نہیں ہے۔ اس کی غرض و غایت انسان کی ذات کی توسیع اور ان کے وتنوع عمل کی جائے آزمایش کی تخلیق ہے۔ مغلوب دنیا ہونے کے بجائے دنیا پر غلبہ حاصل کرنا چاہیئے۔ انسان نائب خدا ہے اس کا حکم عناصر چہارگانہ پہ رواں ہونا چاہیئے۔ آفاق کے ذریعے اشیائے نادیدہ کو دیکھو اور اسرار نافہمیدہ کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

حیات ملیہ کا نصب العین افراد کے مانند خودی کا احساس پیدا کرنا ہے۔ ملت میں خودی کی تولید و تکمیل روایات ملیّہ کے ذریعہ ممکن ہے۔ جس طرح بتدریج ایک بچے کی فہم اور شعور میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ اور حافظ کے زور سے پچھلی باتوں کی روشنی میں وہ اشیأ کو سمجھتا رہتا ہے اور انجام کار اپنی شخصیت کے وجود سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس طرح ملت نوزائیدہ کو ابتداء میں اپنی خودی کا شعور نہیں ہوتا۔ لیکن ایک زمانے کے بعد ایام سے بر سرِ پیکار ہوکر احساس خودی ہونے لگتا ہے۔ فرد حافظے کے زور سے خودی کا شعور حاصل کرتا ہے اور قوم کے لئے روایاتِ قدیمہ کے احساس کا باعث

بنتی ہے ۔ اگر قوم ان روایات کو فراموش کرے تو نیست و نابود ہو جائیگی ۔ پس داستانیں۔ افسانے اور روایات کسی قوم کو اس کی خودی سے آگاہ کرتی ہیں ۔ اور سرگرم عمل بنا دیتی ہیں ۔ پس اے قوم اپنی تاریخ کی حفاظت سے پائندہ اور ایام گذشتہ کی یاد سے زندہ رہ ۔ کل کو آج سے ملا دے ۔ اور ایام کے سلسلے کی مختلف کڑیوں پر قابو پاکر خودی کو زندہ رکھ ۔ ماضی سے حال کا پتہ لگتا ہے اور حال مستقبل کے علم کا باعث ہوتا ہے ۔ اس لئے ماضی حال اور مستقبل کے رشتہ کو مت توڑ ۔

**عورت کی اہمیت** سر اقبال نے اس کتاب میں مستورات کے لائحۂ عمل اور مقصد زندگی پر بھی جامع بحث کی ہے جو ہمارے عنوان سے خارج ہے ۔ لیکن سلسلۂ بحث کے لئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اقبال کے عقیدے میں وہ مائیں قابل ستائش ہیں ۔ جن کی گود سے غیور اور حق پرست مسلمان پیدا ہوں ۔ قوم کا سرمایہ مال اور دولت نہیں بلکہ تندرست ذہین بچے ہیں ۔ مغرب کی ننھی آغوش عورتیں اقبال کو ایک آنکھ نہیں بھاتیں ۔ وہ اپنی قوم کی عورتوں کو فاطمۃ الزہرا کی زندگی کو نمونۂ عمل بنانے کی ترغیب دیتے ہیں ۔ جن کی فرماں برداری ۔ شوہر پرستی ۔ فیاضی صبر و شکر کی داستانیں زبان زد خاص و عام ہیں اور

اور جن کی گود حسینؓ جیسے بندۂ کامل اور عاشق صدق و صفا بچے سے مفتخر ہے۔

## سورۂ اخلاص کی تفسیر

آخر میں سر اقبال مثنوی کے کل مطالب کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر بتاتے ہیں۔ جس میں انھوں نے سورۂ اخلاص کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ اسطرح لکھا ہے کہ وہ ذاتِ پاک جس کا نام اللہ ہے ایک ہے عالم خواب میں اقبال حضرت ابوبکرؓ صدیق کو سورۂ اخلاص کی تفسیر بیان کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں آیت مذکورۂ بالا کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان خدا کی وحدانیت پر ایمان لاکر جمال الٰہی کا عکس بن جائے۔ ثنویت کو چھوڑکر وحدانیت میں گم ہو۔ اپنے آپ کو ترک و افغان کہنا قابل افسوس ہے۔ یکتائی کے پرستار کو ثنویت میں گرفتار ہونا کب جائز ہوسکتا ہے مسلمان ملت واحد کو ہزاروں فرقوں میں منقسم کرچکا ہے اور اس طرح سے مسلمان نے اپنے قلعے پر خود ہی حملہ کیا ہے۔

اللہ صمد (اللہ بے نیاز ہے) لہذا ملت کے لئے بھی یہ امر لازمی ہے کہ غیر سے بے نیاز ہوکر دنیا کے لئے سراپا خیر بنجائے۔ کسی مالدار کے آگے دست سوال دراز نہ کرے اور دوسروں کا منت کش ہونے سے احتراز کرے۔ اپنے رزق کو کمینوں سے نہ لے اور خود کو کم تر نہ سمجھے۔

راہ دشوار است ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر
تا توانی کیمیا شو گل مشو
در جہاں منعم شود سائل مشو

ایک مرتبہ ہارون رشید نے امام مالکؒ سے اپنے دارالخلافت میں مقیم ہونے کی درخواست کی۔ امام جواب دیتے ہیں۔ میں مصطفےٰ کا چاکر ہوں کسی طرح اس حرم پاک سے باہر نہیں آسکتا۔ اگر تجھے علم دین سے رغبت ہے تو خود ہی یہاں آکر میرے شاگردوں میں بیٹھ۔ امام مالکؒ کی یہ بے نیازی خدا کی صفت بے نیازی کے اکتساب کا نتیجہ ہے۔ بس تو بھی غیروں کے افکار فکر کی بندشوں سے آزاد ہو اور پیام مصطفےٰ کو سن لے اور کمینوں کا مرہون منت ہونے سے احتراز کر۔

لم یلد و لم یلد (نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا)

نسل اور حسب اور خاندان کے امتیاز سے آزاد ہو کر مسلمان کے مانند خود کو نسل اسلام سے موسوم کر۔ اگر ملت نے نسب و خاندان کا لحاظ کیا ...... تو اخوت اسلامی میں خلل واقع ہوگا۔ روم اور عرب سے ہمیں علاقہ نہیں ہم افراد ملت۔ ملت محبوب حجازی کے عاشق و باہم دیگر پیوستہ ہیں۔ عشق نبوی ہماری جمعیت کا سرمایہ ہے۔ اور یہ رشتہ عشق نسب کے رشتے سے مستحکم تر ہے۔

ھ

ولم یکن لہ کفواً احد۔ جاننا چاہئے ایک مومن دوسرے سے بالاتر نہیں۔ پس اے ملت۔ تو باطل کے آگے تیغ اور حق کے لئے سپر بن جا۔ تیری نیکی اور بدی کا معیار خدا کا امر و نہی ہو۔ سوائے اس خدائے وحید کی تکبیر کے دنیا میں کوئی دوسرا نغمہ نہ ہو۔ ۲۲

یہ قوتِ پرواز کے باوجود پروں سے کیوں کام نہیں لیتی۔ اور ملت کی بے بسی اس کی قرآن سے مہجوری کا نتیجہ ہے۔ تقدیر پر کیوں الزام لگاتی ہے۔ اپنے آغوش میں قرآن مجید رکھنے کے باوجود تو کیوں شبنم کے مانند حقیر بن کر زمین پر گرتی ہے۔ اقبال اس کتاب کو ایک نہایت ہی موثر مناجات پہ ختم کرتے ہیں۔

# پیام مشرق میں تصوف

پیام مشرق گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب ہے جو اس سے ایک صدی پہلے لکھا گیا تھا۔ اس میں شاعر نے مشرقیوں سے درخواست کی ہے کہ اپنے ذوق ایمان و جوش عشق اور علوم روحانی سے اہل مغرب کو مزین کردیں۔ پیام مشرق میں اقبالؒ نے افراد اور قوم کے لئے اخلاقی۔ ملی اور مذہبی دستورالعمل

پیش کیا ہے۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"اقوام مشرق کو یہ محسوس کرلینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو"

آپ کا عقیدہ ہے کہ جوش اور محبت اور عشق انسان کی باطنی گہرائیوں میں انقلاب عظیم برپا کرسکتے ہیں۔ علوم مغربی اور مادی ترقی سے گو کہ فوری مسرت حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن روح ان سے متلذذ نہیں ہوتی با ایں ہمہ اقبالؒ عقل کو ترقی روح کے ابتدائی مدارج میں ضروری سمجھتے ہیں گو کہ اس کی نارسائی کے قائل ہیں

پیام مشرق چار حصوں پر منقسم ہے۔ ابتدائی حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ جن میں نہایت ہی پُر اثر اور دلکش الفاظ میں خودی کے رموز بیان کیئے گئے ہیں دوسرا حصہ "افکار" مختلف موضوعوں اور چھوٹی چھوٹی نظموں پر مشتمل ہے جو ادبی خوبیوں کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور یہاں شاعر مناظر قدرت اور رموز فطرت کے بیان کرنے میں از خود رفتہ ہوجاتا ہے۔ گناہ آدمؑ مقصد تخلیق

اور تسخیرِ کائنات پر پُرمغز بحث کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں متعدد غزلیات ہیں۔ چوتھا حصہ بعنوانِ نقشِ فرنگ ہے جس میں بعض مغربی فلسفہ دانوں اور اہلِ سیاسیات وغیرہ کا ذکر ہے۔ اور اس کے آخر میں کچھ اور نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ رباعیات میں آپ نے نوامسِ عشق کا رنگین الفاظ اور شاعرانہ زبان میں ذکر کیا ہے۔ تقدیر کے متعلق فرماتے ہیں :-

بپائے خود مزن زنجیرِ تقدیر
تہ ایں گنبد گرودں رہے ہست
اگر باور نہ داری خیز و دریاب
کہ باور واکنی جولانگاہ ہست

انسان کی فوقیت اور نیابتِ الٰہی کا بیان بھی نہایت موثر ہے۔ جس کے باطن میں "کران بے کراں" نہاں ہے۔ تقلید کی مذمت کرتے ہوئے اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے افلاطون یا فارابی کی تقلید نہیں کی اور دنیا کو اپنی آنکھ کے سوا دوسرے کی نظر سے نہیں دیکھا۔ آپ کا اعتقاد ہے کہ درد دل مزید حیات کا باعث ہوتا ہے فرماتے ہیں قلعے کے مانند مضبوط جسم پیدا کر اور اس میں درد آشنا دل کوہ سار کی نہر کے مانند ہو۔ جو دل کہ سوز و درد سے خالی ہے جسم بے جان کے مانند ہوتا ہے۔ اگر تجھ کو جان کی ہوس ہے تو لامتناہی [illegible] کا

طلب گار بن۔ گو کہ کلام سے درد و غم پیدا ہوتا ہے لیکن مجھے یہ درد و غم بہتر معلوم ہوتا ہے اور مجھ کو اپنے دم بدم کے نالوں میں عجیب لطف آتا ہے۔ سکندر بھی میرے عیش و عشرت سے ناآشنا ہے۔ در اصل ملکۂ جسم سے نوائے دل کش بہتر ہوتی ہے۔

برآور ہرچہ اندر سینہ داری
سرود سے۔ نالۂ۔ آہے۔ فغانے

دنیا سرچشمۂ رنج و الم نہیں بلکہ پُرلطف اور میدانِ عمل ہے جس کے ہر ذرّہ میں ذوق نمود پایا جاتا ہے جو لذت ہست و بود کا شاہد ہے۔ اپنی ناآگاہی کی وجہ سے میں گم ہوگیا ہوں۔

تو اپنے پیکر میں خودی تعمیر کر اور ابراہیمؑ کے مانند معمار حرم بن۔ دانہ کے مانند خودبینی کی مدد سے زمین کے نیچے سے پودا بن کر نکل۔ وجود خودی کا احساس مقتضائے فطرتِ انسانی ہے۔ دنیا میں رہنا اور اس کے لذائذ سے ایک گونہ حظ حاصل کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔ میں اس بُستاں سرا میں اپنے دل کو اِدھر اُدھر پا بہ زنجیر کیے بغیر نسیم سحری کے مانند پھولوں کو شگفتہ کرتے ہوئے گذر گیا ہوں دنیا سے کنارہ کش ہوکر انسان آفاق اور انفس کے مطالعہ پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اگر خدا نے اس کو چشم پاک بیں عطا فرمائی ہے تو کیوں نہ انفس و آفاق دونوں کے

علوم پر قادر ہو۔ دنیائے رنگ و بو سمجھنے کے لائق ہے۔ اور اس وادی کے پھول چننے کے لائق ہیں۔ لیکن انفس کے مطالعہ سے بے اعتنائی روا نہیں کیونکہ روح انسانی میں بھی یک شے قابل دید ہے۔

انسان بے خوف رہ کر شیر شرزہ کو ہلاک کرسکتا ہے۔ خطروں کے مقابلے سے خودی مضبوط ہوتی ہے۔

ولیکن من نہ دانم کشتیٔ خویش
بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

مقصد کو معین کرکے بہ ہزار مسرت اس کی تعمیل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے اور اس سفر میں منزل یا انجام کا خیال نہ ہو۔

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم
کہ منزل پیش من جز سنگ راہ نیست
مرا صاحب دلے ایں نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوش تر

ان رباعیوں میں بہت سے نکاتِ تصوف پوشیدہ ہیں جن کا بیان بابِ چہارم میں کیا جائے گا۔

پیامِ مشرق کا دوسرا حصہ بعنوانِ "افکار" متعدد نظموں پر مشتمل ہے۔ میلادِ آدم میں فلسفۂ زندگی اور عظمت آدم کا موثر الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ میلاد آدم کے بعد فطرت مجبور خاک سے ایک خودگر۔ خود شکن۔ خودنگر کے پیدا ہونے

پر مگو حیرت بھی ہوجاتی ہے۔ شیطان آدم کا اغوا کرتا ہے کہ سوز و ساز کی زندگی سکون و امن سے بہتر ہے۔ پھر انسان کو تازہ ملکوں کی سیر کرانے اور اس قطرۂ بے مایہ کو گوہر تابندہ بنانے کا وعدہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام۔ سوختن ناتمام

الغرض آدم بہشت سے باہر آتے ہیں اور زندگی سوز و ساز اور جستجو سے خوش ہوتے ہیں اور حضور الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے دنیا میں آکر موجودات عالم کو مسخر کرلیا۔ در اصل شیطان کے مکر و اغوا میں تسخیر کائنات کا راز مضمر تھا۔ نواسۂ وقت میں دل کے متعلق فرماتے ہیں :-

آوارہ آب و گل۔ در باب مقام دل
گنجیدہ رہ بہ جامے بیں ایں قلزم بے ساحل

علم و عشق کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے اور عشق کہتا ہے اگر عقل میرے ہمراہ ہو تو نور ہوسکتی ہے اور اگر مجھ سے قطع تعلق کرلے تو نار بن جائیگی۔

باز اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ وہ نیک رویّہ اختیار کر۔ سعی و تدبیر میں مشغول رہ۔ جسور اور غیور اور کلاں گیر رہ۔ محنت اور سختی ہی سے دنیا کی خوشی میسر آسکتی ہے۔

زمین سے دانہ چننا غلطی ہے۔ گردوں کی وسعت سے رزق حاصل کر۔ ایک شریف باز بھی اگر زمین پر پاؤں رکھے تو مرغ سرا سے کمینہ تر شمار کیا جانا چاہئے۔ کسی کے ہاتھ سے اپنا رزق مت لے۔ کرم کتابی پروانے سے شکایت کرتا ہے کہ باوجود محنت اور سختی کے میں حکمت زندگی سے ناآشنائے محض ہوں۔ پروانہ جواب دیتا ہے۔ تڑپ سے زندگی زندہ تر ہو جاتی ہے۔ اور تپش سے بھی زندگی کو بال و پر ملتے ہیں۔

حکمت اور عشق کا فرق ملاحظہ ہو۔

بوعلی اندر غبار ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

قطرہ آب دریا میں گر کر خجل ہوتا ہے تو دریا سے آواز آتی ہے تو کیوں اپنی تنگ مایگی پر شرمندہ ہے۔ آ تو میری آغوش میں پہنچ کر گوہر بن جا۔ خدا اور انسان کے درمیان گفتگو ہوتی ہے، جس کا ماحصل یہ کہ انسان نے خدا کی آفرینش کو اپنی قوت تخلیق سے سنوارا۔

سر اقبالؒ نے اپنے فلسفہ "اگر خواہی حیات اندر خطر زی" کو پیام مشرق میں ایک مستقل عنوان دیا ہے ایک غزال دوسرے غزال سے فتنۂ صیاد کے مسلسل خوف

اور اپنے درد دل کا تذکرہ کرتا ہے جس کے جواب میں
اس کا رفیق کہتا ہے۔ خطرے میں بسر کرنے میں
ہی راز زندگی مضمر ہے۔ خطرہ انسان کی توانائی کا
امتحان اور جسم و جان کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔
اقبال فرماتے ہیں۔ دنیا میں کور ذوق ہو کر مت
رہ۔ یہاں یزداں جتنی قوت نیکی موجود ہے۔ لیکن شیطان
جو عموماً برائی کی قوت تصور کیا جاتا ہے پایا نہیں جاتا۔
عشق سے انسان عقل کو فتح کر سکتا ہے۔ لیکن
عشق پر عقل کا غلبہ نہیں ہو سکتا۔

عشق است کہ ہر جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی

اقبال کے لئے انسان کا درجہ اور اسکی شان و
شوکت خدائی سے بڑھ کر ہے۔ ذوق طلب پر انسان
کو فخر کرنا چاہئے۔ اور ایسی بندگی کو خدائی کے جبروت
کے عوض فروخت کرنے پر رضامند نہ ہونا چاہئے۔

تیسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ
جگہ ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں کہ فرنگ
کے درس نے میری عقل کو تو وسعت دی لیکن صاحبان
نظر کی صحبت نے میرے سینے کو روشن کیا۔ لذتِ پرواز
نے مجھے آشیانے میں بیٹھنے نہ دیا۔ لہٰذا کبھی تو شاخ
گل پہ جا بیٹھا۔ اور کبھی نہر کے کنارے۔ انسان نے

اپنی قدر کو نہیں پہچانا ورنہ اس کے آگے لعل درخشاں پتھر کے ٹکڑے سے بڑھ کر نہیں۔ نیز اقبال کی انقلاب پسند طبیعت امروز اور فردا کی داستان کو جو متواتر اور بے انقلاب ہے حیرت خانۂ محض سمجھتی ہے۔

ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ شبنم کے مانند غنچے کے خلوت کدہ سے باہر آکر نسیم سحری کے ہمراہ مست خرام ہو اگر کسی نے تجھے خیاباں سے اکھاڑ پھینکا ہو تو سبزہ کی طرح دوسری مرتبہ پیدا ہونا سیکھ لے۔ دوسروں کے بال و پر کے سایۂ میں زندگی بسر کرنے کی بجائے آزادی سے اڑنا سیکھ جاء آفات اور خطروں کا خوف بے سود ہے۔ اگر تو مضبوط رہے تو بلا انگیز طوفان کی کیا حقیقت ہے تو قلب دریا میں گوہر کے مانند مقیم ہو سکتا ہے۔

عشق اور ہوس کا فرق بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تیشہ فرہاد اور مکر پرویز سے نمایاں ہے۔ مطالعۂ انفس آفاق استعداد اور طلب صادق کا بھی وہ ذکر کرتے ہیں۔ خطرے کو ہمت افزائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں قابل افسوس ہے وہ قافلہ جو اپنی پست ہمتی کی بناء پر ایک ایسے راستے کا خواہش مند ہو جو خطروں سے پاک ہے۔ سالک کشمکش اور سعیٔ پیہم میں خوش ہوتے ہیں۔ ان کی نظر راستہ اور منزل کی جویا نہیں ہوتی۔

اقبالؒ اعلان کرتے ہیں کہ عشق الٰہی اور عنایتِ ایزدی

کے لئے حسب اور نسب کا امتیاز نہیں۔ ممکن ہے کہ ایک سیاہ فام شخص کو کلیم اللہ کا یدِ بیضا عطا ہو۔ انسان کو خدا نے جب چشم بینا عنایت فرمائی ہے تو چاہیئے کہ اس گلشن عالم میں جمال الٰہی کو بے نقاب ملاحظہ کرے انفس کا مطالعہ بھی امر لازمی ہے۔ لیکن عمق فکر میں اس مچھلی کے مانند جو دریا کی گہرائیوں میں رہتی ہے راستے کو گم نہ کرے۔

نقش فرنگ میں علوم مغربی کی بے حقیقتی پر زور دیا گیا ہے۔ اور اہل یورپ کی سطحی نظر کو واضح کیا ہے پھر عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کا فرق بیان کرتے ہیں۔ کہ عقل خود بیں آسمان کے پار جا نکلتی ہے لیکن عقلِ جہاں بیں گمان ظن اور اندازہ میں ہی پایۂ زنجیر رہ جاتی ہے۔

شوپن ہاور کے تذکرے کے سلسلے میں فرماتے ہیں دنیاوی تکالیف سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیوں کہ یہ راحت کا پیش خیمہ ہیں۔ نیٹشے کے متعلق فرماتے ہیں "قلب او مومن، دماغش کافر است" یہ مذہب کا منکر تھا اس لئے اس کا خیال کافرانہ، لیکن اس کا اصول پسندیدہ ہے۔ اس لئے اس کا قلب مومن ہے۔ مولانا رومؒ اور ہیگل کی ملاقات ہوتی ہے اور مولانا ہیگل سے فرماتے ہیں کہ تو عقل سے عشق کا

راستہ کیوں کر طے کر سکیگا۔ چراغ سے آفتاب کب دکھائی دیگا۔ پھر رومی اور گوئٹے کا تعارف ہوتا ہے جس میں مولانا فرماتے ہیں۔ رمز عشق سے آگاہ ہوئے بغیر درگاہِ الٰہی تک کوئی کب پہونچے گا۔ عقل ابلیس سے اور عشق آدم سے منسوب ہے

برگساں کا پیغام سناتے ہیں:۔

"تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود را جدا ز شعلہ مثال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہِ آشنا میار
در مرز و بوم خود چو غریباں گذر مکن
نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است
عقل بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

فرماتے ہیں کہ اہلِ فرنگ عقل کی تائید میں متاعِ عشق کو برباد کر رہے ہیں اور ان میں نہ گرمی ہے اور نہ تڑپ اور نہ مستی۔

"خردہ" میں اصول اخلاق کا ذکر ہے۔ تقلید کینہ اور پست ہمتی کی مذمت ہے اور عفو کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگر تو عفو نہ کر سکا تو دشمنوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو جا۔ مصیبتوں سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ کیونکہ بادِ بہار سے پھول اور خار دونوں ہی اگتے ہیں۔

# زبورِ عجم

پیام مشرق کے ایک دو سال بعد زبور عجم شائع ہوئی۔ جس میں فلسفۂ حیات کے مختلف پہلوؤں پر مباحث ملتے ہیں۔

پہلے حصہ میں خدا کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور دوسرے حصے میں انسان سے خطاب ہے۔ اور تیسرا حصہ محمود شبستری کی کتاب گلشنِ راز کے نمونے پر لکھا گیا ہے۔

اقبال اس کتاب کے شروع میں قارئین سے مخاطب ہو کر صوفیانہ انداز میں عشق اور آہ اور امید اور طلب کے قواء بے نہایت کا ذکر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ انسان کا دل کس لیئے سوزِ آرزو سے بیتاب رہتا ہے یہ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ سبو تو ہمارا ہی ہے لیکن اس کا سبو میں شراب کہاں سے آئے۔ اور انسان میں جستجو اور درد دل کا مادہ کہاں سے پیدا ہوا۔ یہی سوالات ہیں جن کے غور و فکر نے کانٹ کو وجود الٰہی پر یقین لانے پر مائل کیا۔ اس حصے کی دسویں نظم میں اقبالؒ کہتے ہیں۔

میری روح اور نظر نظارۂ الٰہی سے متلذذ ہو رہی ہے۔ اس لیئے میں سنگ خارا سے ایک صنم تراش لوں تو کیوں گناہ گار تصور کیا جاؤں۔ دراصل

علم نفسیات کی رو سے ثابت ہوچکا ہے کہ تصوّر اور گہرے مشاہدہ کا اثر دماغ انسانی میں دیرپا اور پائیدار ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام کے مانند اقبالؒ افلاطون کی عقل جہاں بیں پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ فرماتے ہیں۔ عشق وہ لذت ہے جس سے انسان متواتر محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ عشق کا سمندر ہی کشتی اور ساحل ہے۔ لہذا مجھے گرفتار عشق ہوکر نہ تو کشتی کی خواہش ہے اور نہ کنارے کا ارمان۔

فرماتے ہیں :- "یک ذرۂ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ" فقر وہ ہے جو بغیر تلوار کے دل کی سلطنتوں کو فتح کر لے ایسا فقر شوکتِ دارا اور فرِ فریدوں سے بہتر ہے۔ گو کہ عقل ذوق نگاہ سے بے گانہ نہیں لیکن اس بے چاری میں وہ ہمت کہاں جو عشق میں پائی جاتی ہے۔ گو مجھے معلوم ہے کہ منزل ایک وہم محض ہے۔ لیکن میں اپنی کوششوں سے نہیں تھکتا کیوں کہ سفر میں تھک کر بیٹھ جانا ہمت مردانہ کے منافی ہے۔ حکمت اور فلسفہ نے مجھے گراں بار کر دیا۔ اے میرے رہبر میرے سر سے اس بوجھ کو اتار دے۔ مغربی فلسفے نے میرے عقاید کو متزلزل بنا دیا۔ شک اور شبہوں نے میرے دل کو گھیر لیا۔ بارِ الٰہ میرے دل سے گمان اور شکوک کو دور کرکے یقین پیدا کر۔

اقبالؒ صوفیوں کی طرح اخلاص اور باطنی صفائی کے قائل ہیں اور نماز بے حضور کو بے کار سمجھتے ہیں۔ آخر میں

خدا سے التجا کرتے ہیں۔ اے خدا تو ہمیں اپنے مقام سے آگاہ کر دے اور یہ بتا کہ ہم کون اور کہاں ہیں۔ اور تو کون اور کہاں ہے۔

حصہ دوم میں انسان کی خودی کی کیفیتوں کا بیان ہے اور عشق کی قوتوں کا ذکر رنگین الفاظ میں کیا گیا ہے تڑپ اور عمل پیہم اور سفر جس میں منزل کا خیال نہ ہو۔ مردانہ وار خطروں کا مقابلہ کرنا اور دل کی بے نیازی شرائط فقر متصور کئے گئے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ آنکھوں کو بند کرکے دنیا کو سراب کیوں کہا جائے۔ بچشم خود دیکھیں تو یہ خواب (دنیا) بیداری ہے۔ دنیا کو ہزاروں قافلوں سے بیگانہ وار دیکھا لیکن وہ نظر جو اس کو محجابانہ دیکھے کہاں ہے۔ موج کی طرح سمندر جاودانہ میں غوطے لگائے جائیں اور کنارے کا خیال نہ ہو اپنے داغ جگر کے ایک شرر سے نیستاں کو پھونک دے۔ شعلہ کی طرح خس وخاشاک کو جلانا سیکھ جا۔

اگر انسان نگاہ شوق۔ خیال بلند اور ذوق وجود کا رکھوالا ہو تو دنیا کی کسی شے سے اس کو خوف نہیں ہو سکتا۔

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردہ خود شرمسار تر گردد

فرماتے ہیں کہ :- شاہین کو مرغ سرا کی صحبت سے احتراز کرنا چاہیئے۔ شاہین اپنے بال و پر کو کوتاہ نہ سمجھے

عاشق وہ نہیں جو رقت و آہ و زاری میں زندگی بسر کرے۔ بلکہ عاشق وہ ہے جس کی ہتھیلی میں دونوں جہاں موجود ہوں اور اپنی دنیا آپ تعمیر کرے تو ایک ذرہ بے مایہ ہے۔ ڈرتا ہوں مبادا کہ تو ناپید ہو جائے۔ اس لئے خود کو اتنا پختہ بنا کہ تجھ سے ایک آفتاب طلوع ہو۔ دنیا زندہ دلوں کے لئے خواب پریشاں نہیں بلکہ دوسری دنیا کی تیاری کے لئے میدان عمل ہے۔ ایک مرد آگاہ دنیا میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں اس علم فراست کو ایک ٹنکے کے عوض لینا نہیں چاہتا جو مرد غازی کو تیغ اور سپہر سے بیگانہ بنا دے۔ میں ادراک رازی کو بازوئے حیدر کی طاقت کے عوض دینے کو تیار ہو جاؤں کیوں کہ اس سودے میں سب انتہا نفع ہے۔ ہم آفتاب اور ماہ اور انجم کو اس خاک پاک کے عوض دے سکتے ہیں۔ جس میں ایک دارائے دل مدفون ہو۔

اقبال عشق کی پرزور حمایت کرتے ہیں اور عاشق کامل کی رہبری کو ضروری سمجھتے ہیں۔

من از طریق نہ پرسم رفیق می جوئم
کہ گفتہ اند نخستین رفیق و باز طریق

پس تمام چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک راہ بر
کی صحبت کا طلب گار ہو۔ خودی سے خدا کو اور خدا سے
خودی کو طلب کر۔
اسی حصے کی اڑتالیس ویں نظم میں کہتے ہیں تو
دنیا کو تو دیکھتا ہے۔ لیکن خود کو نہیں دیکھتا۔ کب تک
تو ایسا غافل رہے گا۔ دنیا سے پرے قدم بڑھا۔ کیونکہ تو
اس سے بالاتر ہے۔ نصیب اس شخص کے جو اپنے سینے
میں حرم کو ملاحظہ کرے۔ اور تڑپ کر مقام گفت و شنید
سے گذر جائے۔ درد دل انسان کے لئے بے حد ضروری
ہے۔ اور اس چراغ سے خود کو پہچان سکتا ہے۔
تیسرا حصہ گلشن راز جدید۔ محمود شبستری کی گلشن
راز کی طرح فلسفہ علم مابعد الطبیعات اور علم نفسیات پہ
مشتمل ہے۔ یہ محمود شبستری کا جواب نامہ ہے۔ فرماتے ہیں
وہ خیال جس کی بنیاد عشق پر ہو نور بے اندازہ ہے اور
اور جس تفکر کی بنیاد بحث و مباحثہ اور عقل پر ہو تیرہ اور
تاریک ہے۔ تفکر قید زماں و مکاں سے آزاد ہے۔ اور کائنات
کو مسخر کر سکتا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ دونوں آنکھوں
سے جدا جدا النفس اور آفاق کا مطالعہ کرے۔ اگر ان
دونوں میں سے ایک آنکھ بھی بند کر لے تو گناہ میں گرفتار
ہو جائے گا۔ اپنے خیال کی نہر سے بحر پیدا کرنا اور خیال
کو اس بحر کی گہرائی میں رکھ کر موتی بنا دینا چاہیئے

اس طرح سے دو عالم مسخر ہو سکتے ہیں۔ اور انسان زندۂ جاوید بن سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

منہ پا در بیابان طلب سست
نخستیں گیر آں عالم کہ در تست
اگر زیری زخود گیری زبر شو
خدا خواہی بخود نزدیک تر شو
بہ تسخیر خود افتادی اگر طاق
ترا آساں شود تسخیر آفاق

زندگی بحر اور آفاق اس کا کنارہ ہے۔ کائنات اور انسان دونوں خودی کے ذریعہ وابستہ ہیں۔ اور یہ پوشیدہ قوت انسان اور کائنات کا رشتہ قائم کرتی ہے۔ اس لئے دنیا کا ہر ذرّہ خاص نگاہ اور تعمق فکر کا محتاج ہے۔ اس لئے علم آفاق کو علم النفس کے لئے ذریعہ بنانا چاہیئے۔ در اصل دنیا ہماری خود تجلّی کے سوا کوئی دوسری شئے نہیں۔ پس اقبالؒ فرماتے ہیں کہ زندگی بحر ہے۔ اور عقل و آگاہی اس کا ساحل اور خودی وہ موتی ہے جو قعر دریا سے نکلتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ممکن اور واجب کے وصال سے کیا مطلب ہے۔ اور قرب و بعد و بیش و کم کے کیا معنی ہیں۔ یہاں اقبالؒ ما بعد الطبیعات کے

ئنات کو بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ اس دنیا کا علم جس کے زمین و آسماں و زمان و مکاں اعتباری ہیں، عقل زمین فرسا کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن جاننا چاہیئے کہ یہاں سوائے نورِ الٰہی کے کوئی شئے مطلق نہیں ہے۔ اور یہی ایک لازوال اور لامکان حقیقت ہے۔ اس اندرونی حقیقت کو ہماری عقل سمجھ نہیں سکتی۔ کائنات کے اندرونی اور بیرونی دو پہلو ہیں۔ زمین و آسماں۔ زمان و مکاں اعتباری اور بیرونی اور قابلِ فہم ہیں۔ لیکن اندرونی پہلو جو ہستیٔ مطلق سے منور ہے اس کا علم عقلِ نارسا کے ذریعہ ناممکن ہے۔ ہمارے ضمیر میں خودی زماں اور مکاں کی قید سے آزاد رہ کر مقیم ہے۔ اور اس کی معرفت درحقیقت حسنِ مطلق کی معرفت ہے روح اور جسم کو دو علیحدہ علیحدہ اشیا سمجھنا ناجائز ہے۔

ضمیر انسان کی خودی کی طرح کائنات کی خودی بھی ہے۔ بدن زندگی کی خاص حالت ہے اور یہ روح سے جدا نہیں۔ اہلِ فرنگ جسم و جان کو جدا جدا سمجھ کر ملک دین میں ثنویت ملاحظہ کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور انسان نے وحدت کو کثرت میں تقسیم کر دیا ہے۔ وحدت کا علم رازی کے علم قیاسی اور طوسی کے علم عقلی کے ذریعے نہیں حاصل ہو سکتا۔ ارسطو اور بیکن کے فلسفہ

کے پرے گذر کر ماہ و پروین کو علم لدنی کے ذریعہ مسخر کرنا چاہیئے۔ انسان کی جگہ در اصل قیدِ زماں اور مکاں اور یمین و یسار سے بالاتر ہے۔

نیز جاننا چاہیئے کہ حقیقت کو ظہور میں خاص لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے ایک غیر شے کو بنایا تاکہ اس کے ذریعے خود ظاہر ہو۔ پس عارف و معروف میں امتیاز نیک نیتی کی بنا پر ہوا۔ ہم نے قدیم اور حادث دوش اور فردا ہست و بود باشد میں اپنے اقتضائے طبیعت کے بموجب فرق کیا۔ اس لئے لاحاصل شئے کے لئے تڑپ ہمارے لئے رہبر فطری ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خدا اور بندے میں ایک دوسرے کے وصل کی خواہش پیدا ہوئی۔ من اور تو کا فرق اسرارِ الٰہی ہے۔ اور دونوں زندگئ جاوید کے شاہد ہیں۔ خلوت اور جلوت دونوں نورِ ذات سے منور ہیں۔ لیکن جماعت میں ہونا محبت اور زندگی کی پائیداری کا باعث ہوتا ہے۔ دراصل دنیا خدا اور بندے سے قائم ہے۔ بندے کے دل میں وصالِ حق کا سودا زندگئ مزید اور بصیرت کا باعث ہوتا ہے۔ ہستئ خدا میں گم ہونا انسان کا انجام نہیں ہے اور اس کو اپنے آغوش میں لینے کے معنی فنا نہیں خودی کیوں کہ دوسری خودی کے اندر سما سکتی ہے۔ خودی کا کمال اپنی شخصیت کا جداگانہ وقار قائم رکھنا

ہے۔ خودی کائنات کی حفاظت کرتی ہے۔ ہمارے بغیر خودی کو ظاہر کرنے والا کوئی اور نہیں اور نہ وہ ہمارے ظاہر کیئے بغیر نظر آسکتی ہے۔

پس اپنی خودی سے دست بردار ہوئے بغیر اگر انسان نے اشیاء غیر کا بنظر تعمق مشاہدہ کیا تو گویا وہ جلوت میں رہ کر خلوت نشیں ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس پر متقدمین کاربند رہے۔ اور جو پیغمبر صلعم اور آپ کے اصحابؓ کا شعار رہا اور جو تصوف جدیدہ کے برخلاف نظر آتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:-

خودی کے لیئے جو ضمیر انسانی میں مقیم ہے۔ جسم خاکی حجاب ہے۔ معرفتِ خودی آفتاب کے افق سے طلوع ہونے کے مانند ہے۔ اگر انسان جسم کے پردے کو ہٹا کر جان تک سفر کرے تو دیکھے گا یہاں کون مقیم ہے۔ اور من کے معنی کیا ہیں۔ یعنے اپنے سینے میں یہ قید زمانُ مکاں سے آزاد، خود کو ملاحظہ کرے گا۔ اور لذتِ نظارہ بیان نہیں ہوسکتی۔ اس کو یہ خودی غیر سے الگ اور اس سے خود وابستہ نظر آئے گی۔ مانند خیال انسانی کے جو دماغ میں مقیم ہوتا ہے۔ اور جس کا گذر زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے۔

پس اے انسان تیرا سینہ اس چراغ خودی سے رہے جس کا امین تو روز ازل ہی مقرر کیا گیا ہے۔

پس خودی ہمارے قیاس سے فزوں تر اور اس کل سے بڑھ کر ہے جس کو انسان دیکھ سکتا ہے۔

مسئلہ قضا و قدر کے متعلق اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایمان جبر و قدر کے درمیان ہے۔ اقتضائے فطرت کے لحاظ سے تو انسان ایک گونہ مجبور ہے لیکن صدور اعمال میں آزاد مطلق ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ جبر کا خیال دور کر کے دنیا پر غلبہ حاصل کرے اور قواء فطرت کو اپنا مطیع بنائے عقل جزو کے علم کا سراغ لگاتی ہے۔ اور کل کا علم عشق و رقت یا گریہ و زاری کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے عقل فانی اور رقت باقی ہے۔ عاشق اپنے ایک سانس میں گردش روزگار کو بند کر سکتا ہے۔ انسان مرگِ جسمانی سے کیوں خوف زدہ ہو جب کہ خودی پختہ ہو کر رہ سکتی ہے مرگ جسمانی سے نہیں بلکہ مرگ خودی سے انسان کو ڈرنا چاہیئے درحقیقت انسان کے دل میں ایک نصب العین اور مقصد حیات معین ہوتا ہے۔ اس تک پہونچنا سلوک کہلاتا ہے۔ یہ سفر بے پایاں ہے اور قابل بیان نہیں اور اس سفر میں انسان کبھی بدرجہ تکامل نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے جہاں اس کا سفر ختم ہو۔

نہ مارا پختہ پنداری کہ خامیم<br>بہر منزل تمام و ناتمامیم

سفر بےہم میں حیاتِ جاودانی کا راز مضمر ہے۔ اور

سفر گمان سے یقین کی طرف سلوک ہے جس میں ہر لحظہ انسان کو خودی کے سمجھنے کے لئے ہمہ تن مصروف رہنا ہے۔ تپش محبت اور ایمان اور لذت مشاہدہ کی کوئی انتہا ہی نہیں ہوسکتی۔ ذات مطلق کا وصال تکمیل حیات کا ذریعہ ہے۔ اور اس کا راستہ اس عالم محدود کی قید سے نجات پانا ہے۔ پس چاہیئے کہ اس ذات حق کے تصور سے اس طرح ہم کنار ہو کہ وہ انسان کو دیکھے اور انسان اس کو۔

منور شو ز نور من یرانی
مژہ برہم مزن تو خود نمائی
بخود محکم گذر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

بجائے لن ترانی کے یعنے تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ من یرانی یعنے تو مجھے دیکھ سکتا ہے کہنا چاہئے اور کبھی اپنی خودی کے نظارے سے غافل نہ ہو۔ اور حضور خداوندی کی بدولت اپنی خودی کو پائدار بنائے خدا کی تجلی میں بلکہ اس کی خودی میں فنا نہ ہو۔ پس اس طرح سے واصل الہٰی ہونے والا شخص امام یعنے مرد کامل کہلایا جاسکتا ہے۔ چاہیئے کہ اس کی طلب میں استقلال ہو اور اس کے پانے کے بعد اس سے فیضیاب ہونے کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔

اقبالؒ رمز انا الحق کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہمارے عقل کی بنیاد بعض شکوک اور قیاس پر ہے اور اس کا انحصار حواس پر ہوا کرتا ہے۔ جب ہمارے حواس میں فرق آجاتا ہے تو یہی دنیا دوسری طرح سے دکھائی دینے لگتی ہے۔ گویا دنیا ہماری آنکھ میں کانوں کے فریب کا طلسم ہے۔ لیکن خودی کا تعلق اس کائنات رنگ و بو سے نہیں ہو سکتا۔ جس میں ہمارے حواس کا دخل ہو۔ چشم ظاہر بیں کو خودی کا نظارہ میسر نہیں ہو سکتا۔ اس کے نظارے کے لیئے ایسی نگاہ درکار ہے جو ظن وتخمین اور شکوک سے خالی ہو۔ اگر کہا جائے کہ "من" ہی عالم بیرونی کی طرح وہم وگمان ہے۔ تو دیکھنا چاہیئے کہ اس گمان کا رکھنے والا کون ہے۔ خودی دلیلوں سے بے نیاز ہے اور اس کی معرفت کے لیئے تصور اور تفکر درکار ہے۔ خودی پختہ ہوکر لازوال ہوجاتی ہے۔ اور عاشقوں کا ہجر میں بے تاب ہونا ہی عین وصال ہے۔

دیگر از شنکر و منصور کم گوئے
خدا را ہم براہ خویشتن جوئے
بخود گم بہر تحقیقِ خودی شو
انا الحق گوئے و صدیقِ خودی شو

خودی کی جستجو میں خلوت گزینی اختیار کرنا اور تفکر اور تصور کو شعار بنانا احسن ہے۔ اس مرتبے میں رہ کر

اگر کسی نے انا الحق کہا تو وہ اپنی خودی کی صداقت کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ نفیٔ خودی۔ پس ایسا شخص اسرار وحدت سے آگاہ اور عارف کہلایا جانے کا مستحق ہوتا ہے کائنات کی ہر شئے فنا ہو رہی ہے۔ لیکن انسان آرزو و ذوق و شوق کی وجہ سے خودی کو لازوال کرکے موت کو زندگیٔ جاوید کا باعث بنا سکتا ہے۔ اور اس فراق ظاہری کے بعد وجود مطلق کے وصال سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ خاتمہ میں انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں تو شمشیر ہے تو باہر آ اور ممکنات کو مسخر کرنے کی کوشش کر۔ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کو آشکارا کر دے اور نورِ ایمان سے قلب تاریک کو منور کر۔ رومی کے مانند سوزِ عشق پیدا کر۔ مبادا کہ تہذیب نو کی تقلید میں مادیت کی زیادتی تیری روحانیت کی موت کا باعث بن جائے۔

زبور کا چوتھا حصہ بندگی نامہ۔ غلامی کے جاں گسل اثر اور غلاموں کی فنونِ لطیفہ۔ موسیقی اور مصوری کی تشریح اور غلاموں کے مذہب اور مرد حُر کے فن تعمیر کے متعلق ہے۔ فرماتے ہیں کہ غلاموں کی موسیقی صورت سے متعلق اور معنی سے دور ہوتی ہے۔ اور رنج و اندوہ کو قلب انسانی میں پیدا کرتی ہے۔ جو انسان کو پست ہمت بنا دیتے ہیں۔

در اصل انکی موسیقی ساغرِ جم میں زہر پیش کرتی ہے۔ اس طرح اس کی مصوّری بھی صورت گری کی طرف مائل ہے۔ غلام عشق اور مذہب میں امتیاز کرنے لگتا ہے۔ اور عشق سے کچھ اس کو سروکار نہیں ہوتا ذوق دیدار اور جان بیدار سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس کے فنِ تعمیر میں بھی اشیاء ظاہری کی جھلک نمودار ہونے لگی ہے۔ لیکن مردِ کامل کو ہمیشہ اس آسمان کے پرے نکل جانا چاہیئے۔

# تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

## تصوف کے نقطۂ نظر سے

اقبالؒ کی انگریزی تصنیف تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ ان چھ تقریروں پر مشتمل ہے جو آپ نے مدراس اور بنگلور میں فرمائی تھیں۔ ان خطبات کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوچکا ہے۔ اس میں علم لدنی یا کشف۔ واردات مذہبی کا فلسفیانہ معیار۔ ذاتِ الٰہی کا تصور اور حقیقت۔ اور عبادت۔ انائے انسانی اور تمدن اسلامی اور اس کی اصلیت اور اجتہاد پر

نہایت ہی عالمانہ طریقے سے بحث کی گئی ہے۔

سر اقبالؒ کے عقیدے میں خدا۔ عالم۔ خالق۔ باقی بزرگ اور قادر ہستی ہے اور اس کی نامحدودیت اس کی ذات کی گہرائیوں میں ہے۔ خدا کی انانیت ماسوی اللہ کی انانیتوں کو پیدا کرتی ہے۔ ان انانیتوں کے کائنات میں مختلف درجے ہیں اور خودی کی اعلیٰ ترین تخلیق پیکر انسانی میں رکھی گئی ہے۔ اس بناء پر خدا کا فرمان ہے کہ وہ انسان سے اس کی رگ گردن سے قریب تر ہے۔ گو کہ انسان کی خودی دوسری خودیوں سے مشابہ ہے۔ لیکن ہر شے کی ایک انانیت (INDIVIDUALITY) جدا ہے۔ اور جتنا کہ انسان کو احساس خودی ہوتا جائے گا۔ اسی مناسبت سے وہ حقیقت بین ہوتا ہے۔ چاہیئے کہ کائنات کی مختلف انانیتیں باہم دیگر سرگرم عمل ہوں۔ اعتماد الٰہی نے انسان کو دراصل صفت اختیار سے مزین فرمایا۔

نیز چوں کہ "خودی فطرتاً استقلال اور اثبات کی خواہش مند ہے روح انسانی تلاش علم اور معرفت اور قدرت میں کوشاں رہتی ہے۔ انسان کی خودی باوجود کل معلومات سے مکمل تر ہونے کے ہنوز ناقص ہے۔

انسان نائب الٰہی اور حامل امانت خداوندی ہے
مقصد زندگی ذات الٰہی میں فنا ہونا نہیں بلکہ معرفت خودی اور اس کے اثبات کی سعی و کوشش ہے۔ خودی محدود اور ناقص ہونے کی وجہ سے ایک ایسی شی کے انفصال کی خواہاں ہے جو نامحدود اور کامل ہو۔ خودی یگانہ اور بسیط ہے اور صفات الٰہی کی حصہ دار اور ذات الٰہی کی مظہر ہے۔ عبادات اسلامی خودی کو خالق کے رشتہ قریبی کی یاد دہانی کرتی ہیں عبادت کے وقت انسان اس دنیائے احساس و افعال سے آزاد ہوکر نامحدود کی آغوش میں عبادت میں تسکین اور حظ حاصل کرتا ہے جس کو صوفیائے کرام اتحادِ الٰہی یا وصال حق کہتے ہیں۔

خودی کا آغاز تو ہے لیکن انجام نہیں موت کے بعد وہ اسی عالم میں واپس نہیں آتی۔ بلکہ محدود خودی خدا کی نامحدود خودی تک پہنچتی ہے۔ تاکہ اپنے افعال گذشتہ کے نتائج کو بہ چشم خود ملاحظہ کرے۔ کسی وقت انسان اپنی محدود خودی کو گم نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی فضیلت خودداری یکتائی اور انفرادیت میں پوشیدہ ہے۔ خوشی اور اعمال نیک خودی کو مستحکم کرتے ہیں۔ اور رنج و الم اس کو پراگندہ کردیتے ہیں زندگی جاوید انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ نیز ابعاد

مرگ مادیت کی زنجیروں سے آزاد ہو کر خودی ذکی الحس ہو جاتی ہے اور اپنی ناکامی کو دوزخ کی طرح اور کامیابی کو بہشت کی شکل میں محسوس کرتی ہے۔ دوزخ مقام جاوید نہیں بلکہ خودی کے لئے دارالاصلاح ہے۔ اسی طرح بہشت دائمی نہیں بلکہ ترقی خودی کا ایک درجہ ہے۔ تقدیر ترکیب کلی ہے یا اسرار پوشیدہ کی مظہریت کا قبل از وقت زمانہ احتمال وقوع کے ساتھ ہے جس میں ماضی پیچھے نہیں ڈالا جا سکتا۔ بلکہ حال کے ہمراہ اس پر اثر ڈالتا ہوا گذرتا ہے۔

تقدیر معین کرنے کے معنی کسی شے کی باطنی قوت کا اندازہ اور امکان ہے جو اس شے کی اندرونی طبع کی تہ میں ساکن ہو کر کسی خارجی شے کے بغیر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ضروریات کے اقتضاء سے تمدن کا ظہور ہوتا ہے۔ آدم کا بہشت سے نکالا جانا در اصل انسان کی حالت جبلی اور مشتہیات سے شعور ملکیت اور شخصیت کی طرف ترقی ہے۔ مذہبی زندگی ایمان تفکر اور وجدان میں منقسم کی جا سکتی ہے، اقبال کے نزدیک اولین منزل میں انسان احکام شرع کی پابندی بغیر پس و پیش کرتا ہے۔

دوسرے درجے میں احکام الٰہی کی غرض و غایت سے آشنا ہوتا ہے۔

تیسری منزل میں وصال حق کا مشتاق ہو کر احکام

شرع کو اپنے شعور میں تلاش کرتا ہے۔

مذہب اور علم ما بعد الطبیعات میں قریبی رشتہ ہے دونوں کے راستے جدا جدا ہیں لیکن مقصد ایک ہوتا ہے۔ دونوں وصالِ حقیقتِ مطلق کے خواہاں ہیں اور ہردو آفاق کے مطالعہ کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ سائنس صرف خودی کے وجود سے آگاہی پاتا ہے۔ لیکن مذہب خودی کی فطرت اور اس کے رجحانات کو جاننا چاہتا ہے۔

معرفت خودی کا مقصد محدودیت سے آزاد ہونا نہیں بلکہ شخصیت کی تشریح کو بطور صحیح جاننا ہے اس طرح خودی تیزبین ہوکر اس حقیقت سے آگاہ ہوجاتی ہے کہ دنیا صرف دیکھنے اور جاننے کے لئے نہیں بلکہ تخلیق اور جدّت کو بروئے کار لانے کا مقام ہے۔ مذہب فلسفے سے بالاتر ہے۔ چوں کہ مذہب انسان کے کل قواء کا مظہر ہے اور فلسفہ صرف فکر سے انسان کو متحرک کرتا ہے۔ فکر اور وجدان ایک دوسرے کے خلاف نہیں لیکن اول الذکر صورت پر اور دوسرا معنی پر دلالت کرتا ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں۔ برگساں کا عقیدہ ہے کہ وجدان فکر کی ہی ترقی یافتہ صورت ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ایک حالت سے دوسری حالت تک ترقی

کرتا جائے ورنہ اس کی روح سخت ہو جائیگی۔ اور خدا اس کا مددگار نہ ہوگا اور اس کی حرماں نصیبی کا ذریعہ وہ خود ہی ہے۔ پس چاہیئے کہ اپنی روح کو مشاہدہ اور معرفت کے ذریعے فطرت سے مربوط کردیں۔

جاننا چاہیئے کہ جیسا انسان کے افعال اس کی طبیعت کا آئینہ ہیں اسی طرح کائنات حسن مطلق کا مظہر ہے۔ علم کائنات حسن مطلق کا علم ہے۔ اس لیئے قرآن مجید میں مشاہدہ اور تجربہ کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ اشیائے محسوسات کا مطالعہ و مشاہدۂ مجردات اور معقولات کے علم کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ قلب کے ذریعے انسان حقیقت کا تصور کرسکتا ہے۔ چاہیئے کہ مشاہدات کو وجدان قلب سے متحد بنائیں۔ وجدان حسیات سے بالاتر ہے۔ وجدانی تجربہ فوری۔ موقعتی اور ناقابل تجزیہ ہوتا ہے۔ اور اس وصال کی گھڑی کا حظ بیان سے باہر ہے۔

نیز آپ نے اس کتاب میں مسئلہ زماں اور مکاں پر عالمانہ بحث کی ہے جو ہمارے مختصر مضمون سے باہر ہے اور بہ خوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

# باب سوم

# اقبالؒ ایک مصلح کی حیثیت سے

## دورِ چہارم کا کلام۔ ۱۹۲۰ء سے وفات تک

در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبالؒ
پیغمبری کرد۔ و پیمبر نتواں گفت
(گرامی)

اس زمانے میں اقبالؒ کے خیالات پختہ ہوجاتے ہیں۔ دور اول میں بزم قدرت کے اسرار سربستہ آپ کے لئے پریشان کن تھے۔ اس لئے اس دور کے کلام میں جستجو پائی جاتی تھی۔ دوسرے دور میں اشیائے کائنات کی گہرائیوں میں آپ کی نظر دور رس نے حقایق کو پالیا اور ایک نئی دنیا آپ کو نظر آنے لگی۔ جس کی مدد سے آپ نے اپنی پسماندہ قوم اور افرادِ ملت کے لئے ایک لائحہ عمل تیار کرلیا۔

اس دستور العمل کی اشاعت تیسرے دور کی نمایاں خصوصیت رہی جس حقیقت کو آپ نے سالہا سال کی جگر سوزی و اشک ریزی کے بعد پالیا تھا۔ اسے وہ دوسروں

کے کانوں تک پہنچانے کے لئے بے چین تھے۔

دورِ چہارم میں اقبالؒ ایک مصلح کی حیثیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں آپ کے کلام میں مذہبیت کا عنصر اور زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔ آپ کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ مذہب سرمایہ حیات واصل الاصول ہے جس کے زیر سایہ انسان کل برائیوں سے دور رہ سکتا ہے اس دور کا آغاز جاوید نامہ کی تصنیف سے شروع ہوتا ہے۔ جس کے متعلق رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں جناب ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم۔ اے "اقبال کا ذہنی ارتقا" کے عنوان میں لکھتے ہیں:

"جاوید نامہ اقبالؒ کی یگانہ سرشت کا وہ
بے مثل ثمر ہے جس کی مثال خود اقبالؒ
کے کلام میں اور کہیں نہیں ملتی"

بالِ جبریل، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق ضربِ کلیم۔ اور ارمغانِ حجاز کا ذکر بھی اسی باب میں کیا گیا ہے۔ میں نے اپنے مقالے کا حجم بڑھ جانے کے خوف سے عام طور پر اصل اشعار کے اقتباس سے دانستہ گریز کیا ہے۔ کہیں کہیں جو بحث و دلیل کو پر اثر اور دلکش بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تو وہاں ایک دو شعر بجنسہ درج کر دئے ہیں۔

---

# جاوید نامہ

اقبال کی تصنیف جاوید نامہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی یہ آپ کے فلسفے اور تصوف کے معراج کا زمانہ ہے۔ اور اس کے بعد سے آپکی تصانیف میں ایک طرح سے شان پیغمبری و جلال مصلح نمودار ہونے لگے۔ صوفیائے کرام کی طرح آپ کے عقائد اور تصوف کی پختگی کے بعد آپ کو معراج نصیب ہوتا ہے۔ اور عالم علوی کے اسرار آپ کے دل پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔

جاوید نامہ آپ کی پیغمبرانہ شان کی زندہ مثال ہے کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس کتاب میں معراج نبوی کے روایات کو عہد حاضرہ کے اعتبار سے بیان کیا ہے۔ نیرنگ خیال کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں بعنوان جاوید نامہ چودھری صاحب نے ڈانٹے کی کتاب ڈوائین کامیڈی اور ابن عربی کی فتوحات مکیہ سے کتاب مذکور کا موازنہ کرتے ہوئے ایک فاضلانہ بحث کی ہے جو بخوف طوالت نظرانداز کی جاتی ہے۔

اس کتاب کا مختصر دیباچہ اقبالؒ کے اس عقیدے سے شروع ہوتا ہے کہ بعض اجرام فلکی میں حیات انسانی کا ہونا احادیث اسلامیہ اور سائنس کی رو سے ثابت ہوتا ہے۔ اس عالم سماوات پہ آپ کے تخیل نے پرواز کی اور

بیاباں کے مشاہدات کو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے ابتدا میں اقبالؒ نے انسان کی بزرگی کو ظاہر کر کے اس کے محروم وصال ہونے پر شکایت کا اظہار کیا ہے اور عشق اور جذب اندرونی کی خواہش اور قید زماں اور مکان سے آزادی حاصل کرنے کی التجا کی گئی ہے۔ "تمہید آسمانی" میں آسمان زمین کو اس کی تاریکی اور ظلمت کا طعنہ دیتا ہے اور زمین خدا کے پاس اپنی شکایت کرتی ہے تو ندائے غیبی سنائی دیتی ہے۔

اے زمین از امانت بے خبر
غم مخور اندر ضمیر خود نگر

یعنی یہ کہ تو میری امانت کی حامل ہوئی ہے اپنے قوائے پوشیدہ کو ملاحظہ کر کے خوش ہو جا دراصل تیری خاک سے نور جان ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی عقل کائنات کو فتح کر سکتی ہے۔ اور اس کا عشق عالم علوی کو اپنے زیر فرمان لا سکتا ہے۔ اس وقت ملائکہ گانے لگتے ہیں کہ اس مشت خاک کی روشنی پر نور ہستیوں کے وجود کی بدولت عالم علوی تک پہنچ سکتی ہے۔

پھر تمہید زمینی کا آغاز ہوتا ہے اور شاعر بحالت جنون دشت و کوہ سار کی طرف نکل کر مولانا رومؒ کی ایک غزل گانے لگتا ہے۔ اسی حالت میں شام

ہو جاتی ہے۔ اور ایک پہاڑ کے پیچھے سے مولانا رومیؒ کی روح نمودار ہوتی ہے اور شاعر مولانا سے موجود اور ناموجود اور محمود اور نامحمود کے معنی دریافت کرتا ہے۔

مولانا جواب دیتے ہیں کہ موجود وہ ہے جس کے وجود کی شہادت اس کا ہی شعور دے اور یہ اپنے نور میں اپنے آپ کو دیکھ سکے پھر خود کو دوسرے کے نور میں دیکھ کر اپنے وجود میں یقین لائے اور تیسرا شعور ذات حق کے نور میں خود کو دیکھ کر حاصل ہو۔ اپنے مقام کو پہچاننا اور ذات حق کو بے پردہ دیکھنا عین زندگی ہے۔ مرد مومن صرف صفات الٰہی کے مشاہدے پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ مشاہدہ ذات حق کا بھی طلب گار ہوتا ہے۔ اس طرح کا موجود محمود ہے۔

پھر شاعر مولانا سے حق تک پہنچنے کا طریقہ دریافت کرتا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ جس طرح تو دنیاوی پیدائش کے سبب اس جہان چار سو میں آیا ہے اسی طرح اس پیدائش سے باہر ہو کر تیرا ہستی کی قید سے آزاد اور اس کے بعد سراپا نور دنیا میں پیدا ہونا ممکن ہے لیکن یہ پیدائش مکرر اختیاری ہے۔ پیدائش فطری کے مانند مجبوری سے وقوع میں نہیں آئی۔ اس کلام

کو سن کر اقبال بے تاب ہوجاتے ہیں۔ سحاب سے ایک ایک فرشتہ زروان نمودار ہوتا ہے۔ جو زماں اور مکاں کی روح ہے۔ اور کہتا ہے کہ کل دنیا میرے طلسم میں اسیر ہے سوائے اس شخص کے جس کو قوت اپنی نصیب ہوتی ہے۔ پھر شاعر اپنے جسم کو سبک تر اور آنکھ کو بیدار تر محسوس کرنے لگتا ہے اور مولانا روم کی معیت میں پرواز کرتا ہوا آسمان تک پہنچتا ہے۔ اس کو یہاں ستاروں کا نغمہ سنائی دیتا ہے جو شاعر کو خوش آمدید کہتے ہوئے عظمتِ انسانی کو بیان کرتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں ضربِ قلندری سے سدِ سکندری کو توڑ دے اور کلیم کے رسموں کو تازہ کرکے رونق ساحری کو پراگندہ کر۔ اب شاعر پرواز کرتا ہوا فلک قمر تک پہنچتا ہے۔ یہ ایسی جگہ ہے جس کو محرم کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ کوہستان قمر پر پہنچ کر رومی فرماتے ہیں ہر قسم کے گمان سے پاک ہوجا۔ اور آسمانی رسم و راہ کا خوگر بن جا۔ پھر ہولناک کوہ سار سے گذرنا پڑتا ہے جس کی غار میں ایک عارف ہندی جہاں دوست نامی خلوت گزیں ہوتا ہے۔ یہاں ایک سرمہ آگیں چشم اور عریاں بدن شخص کو ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا پاتے ہیں۔ اور مولانا اپنے ہمراہی شاعر کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

مرد اندر جستجو آوارہ
ثابتے با فطرت سیارہ
پختہ تر کارش زخامی ہائے او
من شہید ناتمامی ہائے او
شعلہ ہا در موج رودایش دیدہ ام
کبریا اندر سجودش دیدہ ام
ہر زماں از شوق نالد چو نال
می کشد اورا فراق و ہم وصال

میں اس کے مقام اور منزل کو سمجھنے سے قاصر ہوں
جہاں دوست رومی سے آدم۔ حق اور عالم کے معنی دریافت
کرتا ہے جس کے جواب میں رومی فرماتے ہیں کہ آدم
شمشیر ہے۔ حق شمشیرزن اور کائنات اس تلوار کے لئے
سنگ فساں ہے۔ پھر مولانا روم فرماتے ہیں۔

اہل مشرق روحانیت کی مبالغہ آمیز تاکید کرتے
رہے۔ اور کائنات سے بے خبر رہے اور مغرب مادیت
کی طرف اتنا راغب ہوا کہ حق سے دور ہوگیا۔ حق
کو دیکھنا شرط بندگی اور خود کو دیکھنا شرط زندگی ہے
اس اعتراض کے باوجود جہاں دوست مشرق کے مستقبل
سے با امید نہیں ہوتا۔ اور کہتا ہے کہ کل میں نے دیکھا
کہ قستمرود کی بلندی پر آسمان سے ایک فرشتہ اتر کر
مشرق کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ تو مشرق

کی طرف کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہا کہ مشرق ہی میں ایک تازہ آفتاب پیدا ہونے والا ہے۔ جو دنیا میں انقلاب عظیم برپا کردے گا۔ پھر شاعر اور جہاں دوست کے درمیان مختصر سوال و جواب ہوتے ہیں۔ مثلاً حرگِ عقل کیا ہے۔ شاعر جواب دیتا ہے ترک فکر پھر جہاں دوست سوال کرتا ہے۔ حرگِ قلب کیا معنی ہیں۔ شاعر جواب میں کہتا ہے۔ ترک ذکر۔ اس طرح سے مندرجہ ذیل سوال و جواب ہوتے ہیں۔

س تن کیا ہے۔
ج مشت خاک۔
س جان۔
ج لا اللہ کا رمز۔
س آدم۔
ج اسرار الٰہی۔
س عالم۔
ج جو اسیلئے ہے
س علم و ہنر۔
ج پوست
س جنت (منزل مقصود)
ج روئے دوست
س دین عامیاں

ج کس بات کو سن کر معتقد ہونا۔

س دین عارفاں۔

ج کسی بات کو دیکھ کر یقین لانا۔

پھر عارف ہندی نو نکات بیان کرتا ہے۔ جنھیں سن کر شاعر بے خود ہوجاتا ہے۔ اور ایک فرشتہ از سرتاپا حسن کا نمونہ بن کر شان جبرئیلی کے ساتھ گاتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

بے درد جہاں گیری آں قرب میسر نیست
گلشن بگریباں کش اے بو بہ گلاب اندر
اے زاہد ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانیست
لیکن تو نمی بینی طوفاں بہ حباب اندر

اس کے بعد وادی یرغمید میں جس کا نام فرشتوں نے وادی طاسین رکھا ہے۔ دونوں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں سنگ قمر کی دیوار پر چار طاسین نبوت لکھے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ طاسین گوتم میں ایک رقاصہ مہاتما کے ہاتھ پر بیعت کرتی ہے۔ اور اس کے تحت میں گوتم بدھ کی تعلیمات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

طاسین زرتشت میں اہرمن زرتشت کی آزمائش کرتا ہے۔ اور اس کو خلوت نشینی پر مائل کرنا چاہتا ہے۔ زرتشت کی تعلیم یہ ہے کہ خودی کو ظاہر کرنا زندگی کا باعث ہوتا ہے۔ آفات و بلیات کے مقابلے

سے خودی پختہ ہوتی ہے۔ اور راہ حق میں جو کچھ کہ پیش آئے احسن ہے۔ خلوت میں درد سوز اور آرزو جستجو ہے۔ اور انجمن میں دیدار یار میسر ہو سکتا ہے۔ دراصل خلوت اور جلوت دونوں ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ خلوت آغاز اور جلوت انجام ہے۔ تاہم راہ حق قافلے کے ہمراہ طے کرنا باعث مسرت ہے۔

طاسین مسیح میں روسی حکیم ٹالسٹائے کے رویائے صادقہ کا ذکر ہے۔ جس میں وہ ایک نازک اندام فرنگن سے گفتگو کرتا ہے۔ اور وہ کہتی ہے کہ قیمت روح القدس کو تونے نہیں پہچانا۔ تونے روحانیت کے عوض مادیت کو حاصل کیا ہے۔ پھر فلک عطارد میں جو مقام اولیا ہے۔ جمال الدین افغانیؒ اور ترکی وزیر سعید حلیم پاشا سے دونوں ملاقی ہوتے ہیں۔ اور ان کے ہمراہ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ اور مولانا رومؒ ان سے شاعر کا تعارف زندہ رود کے نام سے کراتے ہیں۔ جمال الدین مسلمانوں کی موجودہ حالت دریافت کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں زندہ رود کہتا ہے کہ ضعف یقین کی وجہ سے ان کے جسم میں روح مردہ ہو چکی ہے۔ مذہب کی قوت ان میں باقی نہیں رہی۔ تقلید یورپ میں مست ہیں۔ افغانی دین اور وطن کے معنوں کو واضح کرتے ہوئے یورپ کی تعلیم وطن اور دین کو سراپا مکر و

فریب ظاہر کرتے ہیں۔ سعید حلیم پاشا مشرق و مغرب کے اختلافات کو بیان کرتے ہوئے عشق اور عقل کے درجوں کا ذکر کرتے ہیں۔

عشق چوں با زیرکی رہبر شود
نقش بند عالم دیگر شود

اور کہتے ہیں کہ ترکوں نے یورپ کی تقلید میں مقصد حیات کو فراموش کر دیا۔

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہاں تازہ در آیات اوست
عصرہا پیچیدہ در آنات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہاں دیگرش

زندہ رود کہتا ہے:۔

زورق ما خاکیاں بے ناخداست
کس نداند عالم قرآں کجاست

افغانی جواب دیتے ہیں:۔ عالم وہ ہمارے سینے میں پوشیدہ ہے جس کے محکمات حسب ذیل ہیں

(۱) خلافت آدم (۲) حکومتِ الٰہی
(۳) زمین خدا کی ملکیت ہے (۴) حکمت خیر کثیر ہے.
انسان کل کائنات پر حکمراں ہے.
آں چہ در آدم بگنجد عالم است
آں چہ در عالم نہ گنجد آدم است

نیز عالم وہ عاشق ہے جو دوی میں وحدت کو ملاحظہ کرے۔ تصور اور تفکر کی غرض سے کم آمیزی احسن ہے۔ علم اور شوق زندگی کا باعث ہیں۔ تحصیلِ علم کے لئے جلوت اور تحصیلِ عشق کے لئے خلوت ضروری ہے.

(۲) حکومتِ الٰہی کو برحق جان کر بندہ حق ہر مرتبے سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی کا غلام ہوتا ہے۔ نہ دوسرے کو اپنا غلام بنانے کا خواہشمند۔ اس کے لئے دوسروں کی تقلید غلامی کی مرادف ہے۔ پس یورپ کی تقلید سے آزاد ہو کر دامن قرآن کو پکڑ لو

(۳) زمین ملکیت خدا ہے۔ زمین کی طمع میں مکرو حیلہ قابلِ ملامت ہیں

(۴) حکمت کے فوائد بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے حکمت کی تحصیل میں حتی المقدور کوشش کرنی چاہئے لیکن علم اگر دردِ دل کے بغیر ہو تو شر ہے۔

حکمت کے دو پہلو ہیں۔ ایک شیطانی دوسرا سلمانی شیطانی پہلو تو پورے طور سے برباد نہیں کیا جا سکتا

لہذا اس کو مسلمان بنالینا چاہئیے۔ علم عشق کی ہمراہی میں خصلت ملکی ہے۔

پھر سعید حلیم پاشاہ دینِ حق کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے مردِ حق کی تشریح کرتے ہیں۔ جو صرف خدا سے رہبری کا خواستگار ہوتا ہے۔ پھر افغانی آیاتِ مبین کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے ملتِ روسیہ کو پیام دیتے ہیں کہ تو جو جدت کی پرستار ہے مسلمانوں کی حالت سے عبرت حاصل کر۔ فرنگیوں کے آئین اور دین سے پرہیز کر اور مذہب کو چھوڑ دینے کے بجائے توحید کی قائل ہو۔

کردگار خداوندان تمام
بگذر از لا جانب الا خرام
در گذر از لا اگر جوئندهٔ
تا رہِ اثبات گیری زندهٔ

تعلیماتِ قرآن پر عمل کر۔ قرآن کا فقر عین شاہنشاہی ہے۔ ذکر اور فکر میں ایک طرح کا اختلاط ہے۔ ذکر کے بغیر فکر کامل نہیں ہوسکتی۔ ذکر سے قلب مسرور ہوجاتا ہے

پھر زندہ رود پیر رومی کے حکم کے بموجب ایک غزل گاتا ہے۔ اور شاعر کے ذوقِ نظر اور جہانِ تازہ کے دیدار کے شوق کی وجہ سے رومی اس کو فلک زہرہ کی طرف لیجاتا ہے۔ جہاں خدایانِ کہن کی مجلس قایم ہوتی

ہے۔ ان میں ہر ایک ذکرِ جمیل سے ترسندہ اور ضربِ خلیل سے آزردہ نظر آتا ہے۔ ایک خدا مردوخ نامی کہتا ہے انسان کلیسا اور مسجد سے بیزار ہو رہا ہے۔ شاید عہدِ رفتہ واپس آجائے۔ اور از سرِ نو ہماری پرستش ہونے لگے۔ یہ سُن کر ایک دوسرا خدا بعل فرطِ خوشی میں گانے لگتا ہے۔ اور مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی پر خوش ہو کر اور اس کو مغرب کا نتیجہ جان کر کہتا ہے۔

زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس
آنکہ مارا از لحد بیروں کشید
اے خدایانِ کہن وقت است وقت

اس وقت پیرِ رومؒ مستی کی حالت میں غزل گاتے ہیں اور شاعر کو بحرِ زہرا میں لے جاتے ہیں۔ جس میں دو سرگشتہ اور حیران ارواح فرعون و کشنر نظر آتے ہیں۔ فرعون اپنے معرفتِ حقیقی کو سمجھنے میں قاصر رہنے پر افسوس کرتا ہے۔ پھر ایک درویش سودانی نمودار ہوتا ہے اور روحِ عرب کی زندگی کے لئے دعا کرتا ہے نواد۔ فیصل اور ابنِ سعود سے درخواست کرتا ہے کہ سوزِ گذشتہ کو اپنے دلوں میں زندہ کردو۔ خدا کرے کہ خاکِ بطحا سے دوبارہ خالدؓ پیدا ہو جائے۔ اور نغمۂ توحید کی آواز بلند ہو اور فاروقؓ دوسری مرتبہ اس عالم میں جنم لے۔

فلکِ مریخ کے باشندے فرنگانِ ذوفنون کے مانند

زماں اور مکاں پر قادر ہیں۔ اور ایک رصدگاہ سے مریخی انجم شناس بر آمد ہوتا ہے۔ اور رومی اس سے شاعر کا زندہ رود کے نام سے تعارف کراتا ہے۔ یہ منجم کسی زمانہ میں کل دنیا کی سیر کر چکا ہے۔ یہ سب مل کر مرغدین نامی ایک شہر کی گردش کرتے ہیں۔ زندہ رود اور حکیم مریخی کے درمیان مسئلہ قضا و قدر کے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے حکیم مریخی کہتا ہے کہ ہر شئے کی فطرت اس کی تقدیر ہے انسان اپنی آرزو کے مطابق اپنی تقدیر کو تشکیل کر سکتا ہے۔ دنیا والوں نے خودی کو کھو دیا۔ اس لئے تقدیر کے اس نکتے کو سمجھنے سے محروم رہے۔ ہر چیز کو تقدیر کی طرف منسوب کر کے خود خواب گراں میں مبتلا ہونا شرم ناک ہے۔ قوت گفتار ادراک لطیف۔ شعلہ کردار مقتضائے فطرت ہیں۔ انکا بنانے والا خدا ہے۔

زندگی ایک گوہر کی کان ہے جس کا مالک خدا اور امین انسان ہے۔ مرد حق کا مقصد زندگی مخلوق کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ لیکن نیکی بطور تجارت نہ ہو جس سے معاوضے کی امید ہو۔ دنیا کو منزل سمجھ کر یہاں کے فقر اور مسکینی سے رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ دنیا صرف ایک راستہ ہے کسی دوسری منزل تک پہنچنے کا۔ پھر ایک دوشیزہ مریخ دعوئے رسالت کرتی ہوئی عورتوں کے مجمع میں دکھائی دیتی ہے اور اپنی تقریر

میں ان کو ازدواجی زندگی سے رہائی پانے کی طرف مائل کرتی ہے۔ آخر میں رومی عصر جدید کی تہذیب کو بے دین ظاہر کرتے ہوئے زندگی کے لئے عشق کی ضرورت کا اظہار کرتے ہیں۔

دیں نہ گردد پختہ بے آداب عشق
دیں بگیر از صحبت ارباب عشق

فلک مشتری میں حلاج قرۃ العین طاہرہ اور مرزا غالبؔ کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں۔ جنھوں نے نشیمن بہشت پر سیر جاودانی کو ترجیح دی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے خاص انداز میں نغمے گاتے ہیں۔ زندہ رود ان سے ترک بہشت کی وجہ دریافت کرتا ہے۔ جواب میں حلاج کہتا ہے۔ مرد آزاد ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتا۔ پھر علم اور عشق کا فرق بیان کرتا ہے تقدیر کے متعلق کہتا ہے جو شخص کہ تقدیر کے ساتھ اتفاق کرلے اس سے ابلیس اور مرگ دونوں لرزہ بر اندام ہوتے ہیں۔ جبر کا عقیدہ صرف مرد کامل کو پختہ تر بنا دیتا ہے۔ اور مرد خام کو آغوش لحد میں لیجاتا ہے۔ اس عقیدہ جبر کی بناء خالد نے عالم کو تہ و بالا کردیا اور ہم اس عقیدے کی وجہ سے کھوئے جا رہے ہیں۔ تسلیم و رضا مرد حق کا شعار ہے لیکن کمزوروں کے لئے یہ عقیدہ ٹھیک نہیں۔ مرد مومن جبر

الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوا زبانِ حال سے کہتا ہے

با تو ما سازیم - تو با ما بساز

اور اپنے ارادے سے تقدیرِ حق کو متشکل کرتا ہے اور میدانِ رزم میں اس کا تیر خدا کا تیر ہو جاتا ہے۔

زندہ رود منصور کے گناہ کے متعلق سوال کرتا ہے جس کا منصور حلاج یہ جواب دیتا ہے، کہ اس زمانے میں خودی کا سمجھنے والا کوئی نہیں تھا میں حقایق کو آشکار کر رہا تھا۔ لیکن میرے ہم عصروں نے مجھے قابلِ سرزنش قرار دیا۔ آخر میں کہتا ہے:

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس

محشرے بر مردہ آوردی بترس

طاہرہ کہتی ہیں صاحبِ جنون کے گناہ کی بدولت کائنات از سرِ نو زندگی پاتی ہے۔ شوقِ بے اندازہ کا تقاضہ ہے کہ قدامت کے خلاف احتجاج کرے۔ پھر غالبؔ اپنے ایک شعر کے معنے بیان کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہر عالم کے لیے ایک رحمت للعالمین ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر کے استفسار پر حلاج کہتا ہے کہ ہر دنیا کے لیے ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے یا ہونیوالا ہے

پھر زندہ رود رحمت للعالمینؐ کے متعلق استفسار کرتا ہے۔ آیا وہ آدم ہے یا جوہر۔ حلاج جواب دیتا ہے کہ اس رحمت للعالمینؐ کے آگے جو خود کو بندہ

تصور کرتا ہے۔ تمام دنیا سربسجود رہتی ہے۔ اس بندے کا تصور خیال انسانی سے بالاتر ہے۔ جو باوجود انسان ہونے کے اپنے ہم جنسوں سے ممتاز ہے۔ اور جو تقدیروں کو متشکل کرتا ہے۔ پھر سر اقبال عبدہ کی تفسیر میں عبد کو مرد حق بیان کرتے ہیں۔ دیدار عشق اور ذوقِ دیدار کی تشریح کرتے ہوئے حلاج کہتا ہے کہ مستی تصور حق اور پھر حق کے جلوے کو کائنات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ زہے قسمت اس مرد کامل کے جو اپنے ایک نعرۂ حق سے نو آسمانوں کا طواف کرے اور افسوس اس درویش پر جو ہائے ہائے کرنے کے باوجود خدا کا حکم خود پر اجراء نہ کرے اور خانقاہ کا جویا ہوکر میدان جنگ سے عذر کرے۔ اگر انسان حق پرست ہو تو دنیا کو فتح کرکے تقدیر کو اپنی تدبیر کا ہم روش بنا سکتا ہے۔ دنیا میں حق کی اشاعت کبھی قاہری کے زور سے اور کبھی دلبری سے ہوسکتی ہے۔ لیکن دل بری کو قاہری پر ترجیح دینی چاہئے۔ عاشق اور زاہد کا فرق یہ ہے کہ زاہد دنیا میں غریب اور عاشق عقبیٰ میں غریب ہوتا ہے۔ پھر زندہ رود سوال کرتا ہے۔ کیا معرفت کی انتہا فنا ہے۔

یہاں حلاج عام تصوف کے خلاف جواب دیتا ہے کہ یعنے دنیا اور ومافیہا سے بے خبری کے عالم میں فقدان عمل ہی پیمانگی اور نیستی اور بوجہ بے گانگی ہے۔ فنا

سے مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

پھر زندہ رود پوچھتا ہے کہ اس مشتِ خاک گردوں آشنا میں آتش سوز کہاں سے آئی جواب میں حلاج کہتا ہے۔ در اصل عاشق کی محرومی اس اس کے سوز دروں کی ترقی کا موجب ہوتی ہے۔ درد کے بعد خوشی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ ابلیس جیسے خواجہ اہلِ فراق نمودار ہوتا ہے۔ آدم کی شکایت کرتا ہے کہ کبھی اس نے میرے حکم سے سرتابی نہیں کی جس کی وجہ سے میری ہمت پست ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا حریف مقابل بن کر ایک صاحبِ نظر پیدا ہو جس سے شکست پاکر میں لذت محسوس کرسکوں۔

پھر فلک زحل کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے قلزم خونین میں ملک و ملت کے غدار رہتے ہیں اور جن کو دوزخ نے بھی اپنے دامن میں لینے سے انکار کردیا۔ ان میں غدار جعفر بنگال اور صادق دکن شامل ہیں۔ جنھوں نے سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے غداری کی۔ پھر روح ہندوستانی ظاہر ہوکر ہندوستان کی تباہ حالی پر نالہ و فریاد کرتی ہوئی کہتی ہے کہ غلامی کا سبب ہندوستان میں غدارانِ وطن کی موجودگی ہے۔ پھر دونوں مسافر افلاک کے پار جاتے ہیں اور جرمنی کے مشہور فلسفی نٹشے سے ملاقات کرتے ہیں جو نہایت

ہی سوزناک آواز میں دردمند نالہ کر رہا تھا اس کے متعلق مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ زمانۂ حیات میں اس کے الفاظ بیباک اور اس کے افکار عظیم الشان تھے اور اس بڈھے اپنی قوت گفتار نے مغربیوں میں ہل چل مچا دی تھی۔ یہ در اصل عاشق و مجذوب تھا۔ دیوانہ نہیں تھا جیسا کہ عوام کا خیال ہے۔ وہ عشق میں مست ہوکر وصال الٰہی کا طلب گار اور مقام عقل و حکمت سے ماورا مقام کا طالب تھا۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ صرف لا تک پہنچ کر ساکن ہوگیا اور الاّ تک اسکی رسائی نہ ہوسکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی خودی اور خدا دونوں سے بےگانہ ہوگیا۔ اگر اس وقت اس کو حضرت شیخ احمد سرہندی جیسا پیشوا نصیب ہوجاتا تو سرور سرمدی کو پالیتا۔

پھر دونوں مسافر جنت الفردوس کی طرف بڑھتے ہیں جو ایک خوش منظر اور لازوال جگہ ہے لیکن ان عمارتوں کی خوبصورتی خشت اور سنگ سے نہیں بلکہ اعمال کی وجہ سے ہے۔ قصر شرف النساء کی طرف جاتے ہیں جو دنیا میں ہمیشہ ایک چبوترے پر بیٹھ کر روزانہ قرآن شریف کی تلاوت مرصع تلوار کو آگے رکھ کر کیا کرتی تھی اور بعد وفات اسی چبوترے میں دفن کی گئی۔ اور قرآن اور تلوار حسب وصیت قبر کے اوپر رکھے گئے۔

الغرض شرف النساء مسافروں سے کہتی ہیں کہ تلوار اور قرآن ایک دوسرے کے محافظ اور محور کائنات زندگی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ان چیزوں کو پس پشت ڈال دیا تو ان کا معدوم ہوجانا امر یقینی ہے۔ پھر سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کشمیری کی زیارت ہوتی ہے۔ شاہ ہمدان سے زندہ رود شیطان کی تخلیق اور خدا کی انسان سے فرمان برداری کی توقع پر گفتگو کرتا ہے شاہ ہمدان جواب دیتا ہے کہ صاحب خودی نقصان سے بھی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ شیطان سے جنگ کرنا آدم کے لئے خوبی کا باعث ہے۔ شیطان سنگ فسان ہے اور خودی تلوار ہے۔

پھر زندہ رود خطۂ کشمیر کی حالت کہن اور موجودہ حالت کا موازنہ کرتا ہے شاہ ہمدان کہتے ہیں کہ جسم کو روح کی ترقی کے لئے کمزور بنانا احسن ہے بشرطیکہ اس سے حق کی حفاظت ہو اور معرفت خودی نصیب ہو جس سے زندگی جاوید ہاتھ آتی ہے۔

پھر زندہ رود تخت و تاج کے متعلق سوال کرتا ہے جس کے جواب میں کہتے ہیں کہ صرف دو قسم کے لوگوں کا باج گذار ہونا جائز ہے۔ انصاف پسند حاکم اور بہادر فاتح کا۔

غنی کی روح مستقبل قریب کے لئے امید افزا پیغام

بسر کرنا گراں ہوتا ہے۔ قوتِ تخلیق سے محروم شخص ہمارے نزدیک کافر اور زندیق سے زیادہ نہیں اگر تو مردِ حق ہے تو شمشیر کے مانند کاٹنے والا بنجا۔ اور اپنی دنیا کو خود ہی تشکیل کر۔

زندہ رود کے مایوسانہ الفاظ کے جواب میں پھر ندائے جمال آتی ہے۔ زندگی کے معنے سانس کا مسلسل لینا نہیں، بلکہ اس کی اصل حی و قیوم سے ہے۔ انسان توحید کا پرستار ہوکر لاہوتی بن سکتا ہے اور ملت جبروتی ہوسکتی ہے۔ اس توحید میں فقر اور شاہنشاہی کے اسرار مضمر ہیں۔ اگر عالم کو اپنے باطن میں غرق کرے تو تو بندہ اور خدا کے فرق کو سمجھ سکے گا۔ پھر تجلیٔ جلال نمودار ہوتی ہے۔ اور اس تجلی کی تاب نہ لاکر شاعر موسیٰ کی طرح بیخود ہوکر گر پڑتا ہے۔ اور افسونِ افرنگ سے دوری اور اتحادِ ملت کے متعلق ایک نغمہ سنائی دیتا ہے

اس کتاب کے آخر میں سر اقبال اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرکے زمانہ حاضرہ کے نوجوانوں کو پیغام دیتے ہیں:۔ فرماتے ہیں کہ آجکل کے مسلمانوں کی نماز میں خلوص نہیں ہے۔ مسلمان ساکن اور بے ذوق رہ گئے ہیں۔ میرے مانند ذوق اور سوز سیکھ لے۔ لاالٰہ کو اپنے جان سے کہہ تاکہ تیرے اندام سے اس کی بو نکل آئے۔ کم خور، کم خواب اور کم گفتار رہ۔ اور اپنی خودی کے اطراف پرکار کے مانند

گردش کر۔ اخلاص میں مستقل رہ۔ خوف سلطان اور امیر سے دور ہوجا۔ قہر اور رضا میں بھی عدل کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔ فقر میں بھی اپنے ارادے اور اعتدال کو پست ہونے نہ دے۔ حکم الہیٰ کی تاویل کے بعد قلب سے اس کی شہادت طلب کر۔ سیر کی لذت سے محظوظ ہو۔ اشیائے دنیاوی کا خیال تجھے بے تاب نہ کرے۔ اپنے مقاصد کو بلند رکھ۔ صادق الکلام ہوکر خلوت و جلوت میں جمالِ الہیٰ ملاحظہ کر۔ الماس کی طرح سخت بنجا۔ دل کو حق کی طرف پھیر کر بے وسواس رہ۔ مرد مومن کی نشانی سوائے قرآن۔ شمشیر اور اسپ کے اور کیا ہے۔ سلطانِ گجرات مظفر بن سلطان محمود کی طرح شرع کا احترام کر جس نے ایک شراب سے شفاء پائے ہوئے چست و چالاک گھوڑے کو استعمال کرنے سے شریعت کی بناء پر انکار کردیا۔ دین کے معنے طلب ہیں سراپا جل جانا ہے۔ جس کی انتہا عشق اور آغاز ادب ہوتا ہے۔

حرف بد را برلب آوردن خطا است
کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترام آدمی۔
با خبر شو از مقام آدمی۔

پھر فرماتے ہیں۔ دنیا میں سوائے دردِ دل

کے کسی اور چیز کا طلب گار مت ہو۔ خدا سے نعمت کا خواستگار ہو۔ سلطان کے سامنے دستِ سوال مت دراز کر۔ نعمت کی زیادتی سوز و گداز کو دل سے مٹا دینے والی ہے۔ تاویلِ قرآن سے بے نیاز رہ۔ اور صوفی درندے اور گرگ ہیں۔ ان سے دور رہ۔ نیکی میں خواص حصہ نہیں لیتے۔ صدق و صفا صرف عوام میں نظر آتے ہیں۔ اہلِ دیں اور اہلِ کیں میں امتیاز کرکے اہلِ حق کی صحبت میں رہ۔ مردِ حق یکایک پیدا ہوتا ہے۔ جو اہتمام کائنات میں شریک ہوتا ہے۔ وہ خلیل۔ کلیم مسیحؑ اور محمدؐ کتاب اور جبرئیلؑ کا مجموعہ صفات ہوتا ہے اور یہ اہلِ دل کی دنیا کا آفتاب اور ان کی زندگی کی شعاع ہے جو اپنے پیرہن کو عشق میں جلاکر سلطان بنا دیتا ہے۔

عہد حاضر مادیت کی ترقی کی طرف متوجہ ہے۔ اس لئے مرد حق کو جو خودی میں ...... پوشیدہ ہے تو پہچان نہیں سکتا۔ تاہم تو ذوقِ طلب سے اس کو ڈھونڈتا رہ۔ اگر تو اس طرح کا کوئی شخص نہ پا سکے تو مولانا رومی کو ہی اپنا رہبر بنا لے۔ مولانا کی شرح بیان سے باہر ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے جان کو وجد میں لانا چاہیے۔ ماسوی اللہ سے چشم پوشی اختیار کرنی چاہیئے۔ خود پر غلبہ پانے والا بہترین شخص ہے۔ فقر حاضرہ انسان کو حریص بنا دیتا

ہے۔ لہذا اس سے احتراز لازمی ہے۔ یہی یہی دینِ مصطفٰےؐ کا راز ہے۔ جس سے تجھ کو آگاہ ہونا چاہئیے۔

اقبالؒ کی یہ مثنوی اپنے انداز میں بے نظیر ہے اور اسرار خودی اور رموز بے خودی کے مانند اس میں آپ کے خیالات کا مسلسل اور وضاحت سے ذکر آیا ہوا ہے۔ اور چونکہ آپ کی شانِ پیغمبری کے نمودار ہونے کے بعد یہ پہلی مثنوی ہے۔ اس کا ذکر اوراق بالا میں دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔

---

# بالِ جبرئیل میں تصوف

بالِ جبرئیل ۱۹۳۵ء کی اردو تصنیف ہے۔ اس کتاب کے متعدد حصے ہیں۔ پہلا حصہ نظموں اور رباعیات پر اور دوسرا صرف رباعیات پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں متعدد عنوانات پر نظمیں موجود ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں آپ کو پورے طور سے تسکین قلبی حاصل ہو چکی ہے۔ کلام میں بے ساختہ پن آچکا ہے اور آپ کے اشعار دعائیہ ہونے لگے ہیں۔ پند و نصیحت سے آپ کا کلام لبریز ہو چکا ہے۔ خدا سے دعا

کرتے ہیں۔

کر پہلے مجھ کو زندگئ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جسکی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جسکی کسک لازوال ہو
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اپنی شان فقر کے متعلق فرماتے ہیں:-

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہو ساقی

آپ کو شکایت ہے کہ آج کل بیشہ تحقیق شیر مردوں سے خالی ہو گیا۔ اور لوگ صوفی اور ملّا کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ پھر منصور کی طرح چلّا اٹھتے ہیں۔ جس وقت سے کہ میں نے "لا الٰہ الّا اللہ ھو" کی شراب نوش کی ہے من و تو کا فرق مٹ گیا۔

پھر آپ ایک ایسی آزادی کے متمنی ہوتے ہیں جس میں نہ جینے کی پابندی ہو اور نہ موت کا کھٹکا رہے

نیز فرماتے ہیں یہ مذہب ہی تھا علم نہ تھا جس نے حضرت اسمٰعیل کو اطاعتِ پدری میں موت کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مائل کیا۔ آپ کا مذہب ہے کہ عشق کی وجہ سے فقیر دارا و پرویز بنجاتا ہے۔ ایک جگہ آپ

فرسودہ ستاروں اور فلک کہنہ سے بیزار ہوکر عالمِ نو کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں نہ زمانہ کے ساتھ سازگاری اختیار کرنا بے خبری کی دلیل ہے۔ اگر زمانہ ہمارا ہمدوش نہ ہو تو اس کے ساتھ جنگ کرنے پہ آمادہ ہونا چاہئے۔

فرماتے ہیں مجھے رازی کے فلسفے نے اپنی طرف لے جانا چاہا تھا۔ لیکن رومی کے سوز و ساز نے آخرکار مجھے اپنی طرف مائل کرلیا۔

سلطنت اور فقر کا امتیاز یہ ہے کہ سلطنت کی تحصیل بوجہ تیغ بازی اور فقر کی تحصیلِ نگاہ کی تیغ بازی سے ہوسکتی ہے۔

پھر دانش نورانی اور دانش برہانی کا موازنہ کرتے ہیں۔ دانشِ بُرہانی حیرت کی زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔

خدا سے شکایت کرتے ہیں کہ کیا تیرے مسند کا شاہکار وہ ہو جو نہ خودبیں ہو اور نہ خدا بیں اور نہ جہاں بیں۔

نومبر ۱۹۳۳ء میں حکیم سنائی کے مزار اقدس کی زیارت کرنے کے بعد ان کے قصیدے پہ کچھ اشعار لکھتے ہیں۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
نگاہ پیدا کرلے غافل تجلی عین فطرت ہے

کہ اپنی موج سے بے گانہ رہ سکتا نہیں دریا

فرماتے ہیں معراجِ نبوی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان آسمان پر پہنچنے کی قدرت رکھتا ہے۔

عمل بے غرض کی جزا حور۔ قیام۔ بادہ اور جام سے پرے ہے۔

تیری آنکھ ایسی گرم ہو جس سے شہروں کے حواس باختہ ہو جائیں۔ گوسفندوں کے مانند آہ سرد سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

آپ کے کابل میں لکھے ہوئے اشعار میں شکایت ہے کہ کیوں خداوندانِ مکتب نے شاہین بچوں کو خاکبازی کی تعلیم دینی شروع کر دی ہے۔

فرماتے ہیں خودی میں ڈوبنا اور اس بحر سے پیدا کنار سے ابھر آنا صرف باحوصلہ اشخاص کا کام ہے۔

دوسرے حصہ میں مختلف رباعیات کے تحت فقر اور عشق۔ طلب۔ بے خوفی۔ یقین۔ تسخیر آفاق۔ علم و فقر اور مردِ مومن کے لوازمات اور صفات کو بیان کیا گیا ہے، ان کا ذکر باب چہارم کے عنوانات مذکورہ کے ذیل میں کیا جائیگا۔ تیسرے حصہ میں مختلف عنوانات پر نظمیں لکھی گئی ہیں۔ جاوید کے نام پیام بھیجتے ہیں۔

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

پہلے انسان میں طلب صادق ہونا چاہئے۔ جو شخص بوجہ اپنی فطرت کے لائق پرواز نہیں۔ اس کو انجام کار موت کا نوالہ بننا پڑتا ہے۔

ہر سینہ جبرئیلؑ امیں کی قیام گاہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہر فکر طائرِ فردوس کو گرفتار کر سکتی ہے۔

یقین پیدا کرو کیونکہ یقین سے ہی وہ درویشی میسّر ہو سکتی ہے جس کے سامنے فغفوری سربسجود ہوگئی۔

پروانہ اور جگنو کی نظم میں جگنو پروانے کو طعنہ دیتا ہے کہ میں آتش بیگانہ کا قائل نہیں۔

محبت کے عنوان میں فرماتے ہیں۔

میرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

فلسفہ اور علم کے متعلق فرماتے ہیں۔ فلسفہ بلند بال تو ہے۔ لیکن جسور و غیور نہیں۔ اس وجہ سے یہ اسرار محبت سے ناآشنائے محض ہے۔

اس حصے کے شروع کی دعا میں اقبال اپنے نرالے انداز میں خدا سے شکوہ کرتے ہیں۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو

کائنات کے متعلق فرشتوں کا گیت سُنکر فرمانِ حق صادر ہوتا ہے ۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

یہ نظم بے ساختگی اور سوز و گداز میں بے نظیر ہے۔ آپ دین اور سیاست میں دوئی کو تباہ کن سمجھتے ہیں ساقی نامہ اس زمانے کی آپ کی معرکۃ الآرا نظم ہے ۔ جس میں مختصر الفاظ کے ذریعہ شاعر کے جذبات اور تخیل کی تصویر کھینچی گئی ہے ۔

ابتدا میں مناظرِ فطرت کی خاکہ کشی سیاست اور مسلمانوں کی جمود کا بیان ہے ۔آپ مسلمانوں کے شراب عشق میں تڑپنے کے خواہش مند اور دل مرتضیٰؓ اور سوز صدیقیؓ کے اکتساب کے متمنی ہوتے ہیں ۔

پھر فلسفۂ حیات کے موضوع پر بحث کی گئی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ زندگی کے آثار کائنات کے ہر ذرّے میں پائے جاتے ہیں اور ہر شے میں سبر و سکون دونوں نظر آتے ہیں ۔ تاہم یہ فریب نظر ہے ورنہ کائنات کے ہر ذرے میں عجیب قسم کی تڑپ موجود ہے ۔۔ اور ہر لحظہ اشیائے نو کی تخلیق ہو رہی ہے ۔ خودی زندگی کا راز اور کائنات کا اسرار ہے ۔ اس کا نشیمن قلب انسانی ہے ۔ حوادث زمانے سے اس کی انفرادیت میں خلل واقع نہیں ہوتا۔

ملکہ یہ چاند کی کرن اور پتھر کا شرر بنکر چاند اور پتھر میں جدا جدا مقیم رہتی ہے۔ خودی کا پاسبان کسی شاہنشاہ کے آگے اپنا سر نہیں جھکاتا۔

مقصد زندگی یہ ہے کہ معرفت خودی حاصل کرے فرشتے آدم کو اس کی عظمت و جمال اور قواء پوشیدہ کا ذکر کرکے بہشت سے رخصت کرتے ہیں اور زمین کی روح اس کا استقبال کرتی ہوئی کل اشیائے کائنات کو اس کا غلبہ حاصل کرنے کے لئے پیش کرتی ہے۔

پھر رومی اور مرید ہندی میں مکالمہ ہوتا ہے۔ رومی فرماتے ہیں علم کو تن کے لئے استعمال کرنا برا اور اور اس کو دل کا مددگار بنانا احسن ہے۔ حکم جہاد کے استفسار پر فرماتے ہیں۔ جہاد اگر امر حق کے ماتحت ہو تو نیکی ہے۔

انسان کا مقصد اکتساب نظر ہے نہ کہ خبر پس زیرکی کو چھوڑ کر حیرانی اختیار کرنی چاہئے کیونکہ زیرکی گمان اور حیرانی عین دیدار ہے۔

عقیدۂ جبر اوصاحب دل اور صاحب نظر اشخاص کو خدا سے واصل کرتا ہے۔ لیکن عوام کو یہی عقیدہ اسفل السافلین کے درجے پر پہنچاتا ہے۔

دوسرِ دل کے لئے باز دوش نہ ہونا دل کی بے داری کی علامت ہے۔ ملت کی زندگی دام بنکر دوسروں کو گرفتار

کرنے میں مضمر ہے۔ اہلِ دل کی جستجو میں کوشاں رہ کر فلک پر پرواز کرنے کے بعد زمین پہ بسیرا کر۔ مردوں کا کام روشنی اور گرمی اور کمینوں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے۔ جبریل اور ابلیس میں ایک مکالمہ ہوتا ہے ابلیس کو کائنات کے سراپا سوز و ساز اور درد و داغ اور جستجو اور آرزو ہونے پہ شکایت ہے اور اپنے منکر آدم ہونے کو داستان آدم کی رنگینی کا سبب بتاتا ہے۔ پھر اقبال" "نپولین کے مزار پر" "مسولینی" "نادر شاہ افغان" اور خوش حال خان کی وصیت" "تاتاری کا خواب" وغیرہ عنوانات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جن کا ہمارے نفس مضمون سے تعلق نہیں۔ "تاہم آپ کی نظم "حال اور مقام" خاص تصوفانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ تصوف کی زبان میں حال اس کیفیت کو کہتے ہیں جب سالک کبھی کبھی خود کو واصل معشوق محسوس کرتے ہوئے خوشی سے از خود رفتہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن جب یہ کیفیت دیر تک قائم رہ جائے تو اس کو بنام مقام موسوم کرتے ہیں۔

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

آخر میں فقر کی دو قسموں کا ذکر ہے۔ باطنی اور ظاہری۔ ایک کی بناء مکر و فریب پر ہوتی ہے اور اس کا مقصد قوموں میں مسکینی اور اداسی کی تعلیم دینا اور دوسرا شیر جیسا فقر جس میں اسرار جہانگیری مضمر ہوں مسلمانوں کی میراث ہے۔

# پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق مع مسافر

مثنوی "پس چہ باید کرد" مولانا رومیؒ کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ جوہر کے اقبال نمبر میں "پس چہ باید کرد" کے زیر عنوان پروفیسر سید نواب علی لکھتے ہیں:

> مولوی معنوی کی مثنوی کی طرح اس میں بھی وہی جوش وہی سوز اور وہی تخیل ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زبان پہلوی کے قرآن کا سورۂ اخلاص ہے۔

اس میں اقبال مجملاً اپنے عقائد تصوف کا ذکر کرتے ہیں۔ ابتداء میں قارئین کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:-

سپاہ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

تمہید میں لکھتے ہیں کہ رومیؒ کی روح بت خانہ

تخیل کو توڑتی ہے اور شاعر کو خلیل اللہ کی طرح مست ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ کم نظر جذب کو جنوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں در اصل اسی جنوں سے ملتوں زندگی ثابت ہے۔ مومن عزم اور توکل کی وجہ سے ظاہر اور طاقتور ہوتا ہے۔ وصال کے معنی فنا نہیں بلکہ عین وصال میں اپنی انفرادیت کا قائم رکھنا ہے۔ زہے نصیب اس مرد حق کے جس کا قلب ماسوی اللہ کی زنجیروں سے آزاد ہو جائے۔ فقیر کے لیئے اس کی گدڑی بھی بار ہے۔ اس کے نزدیک صبا کے مانند کوئی سر و سامان نہیں ہوتا۔

مہر عالمتاب سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اے آفتاب مجھے تو اپنی تجلی میں مستور کرلے، تاکہ میں افکار شوق کو بیان کرکے اسرار شوق کے سینوں کو منور کردوں۔ اپنی نوا سے ہر خام کو پختہ کردوں اور دنیا میں انقلاب عظیم برپا کردوں۔ تاکہ اہل دنیا کی فکر بند فرنگ سے آزاد ہو جائے

حکمت کلیمی کو حکمت فرعونی کے

**اللہ بس باقی ہوس** مقابلہ میں پیش کرکے کہتے ہیں۔ حکمت کلیمی خام کو پختہ کرتی ہے، اور اس کا درس "اللہ بس اور باقی ہوس" ہے، بے تاج و تخت حکمرانی کرتی ہے۔ اور اس کی آہ سحرگاہی سے کائنات کو حیات اور صبح نمود سے اس کو تازگی ملتی ہے۔ "لا خوف"

عزم تسلیم اور رضا اس کی تعلیم ہے۔ اس کی صحبت میں خزف در بن جاتا ہے۔ فقر کے لیئے حال میں عافیت ہے۔ جاہ و جلال میں نہیں۔ فقر کے لوازمات صدق۔ اخلاص۔ نیاز۔ سوز اور درد ہیں۔ بجائے سلاطین کے محلوں کے طواف کے خودی کا طواف کرنا چاہیئے۔ اپنی عظمت کو پہچان کر دنیا کو اپنی مراد کے موافق تشکیل دینا ضروری ہے۔ در اصل یہی فنا ہے جو خدا کے ارادے سے وقوع ہوتی ہے۔ اور گوہر کو صدف سے باہر لاتی ہے۔ جلال حق سے حسن حقیقی کا علم اور اس کے دید کی لذت افزائی ہوتی ہے۔ حکمت فرعونی بے عملی مکر و فریب اور غلامی اور خودی سے بے گانگی کی تعلیم دیتی ہے جو انسان کی تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔

اقبالؒ لا اللہ کا مفہوم سمجھا کر فقر کی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی بیکسی اور لا مذہبی کا نقشہ کھینچ کر مرد مسلم سے کہتے ہیں۔ بحر خود سے قطرے کنارہ کشی اختیار کر۔ خوف و وسواس و ہراس سے دست بردار ہو اور اپنی خودی کو تیزی شمشیر عطا کر اور اس کے بعد خود کو تقدیر کے حوالے کر دے۔ مرد حر کی تشریح کرنے کے بعد اسرار شریعت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ خدمت دین کے لئے مال جمع کرنا احسن ہے۔ ورنہ یہی مال اُمت کی تباہی کا ذریعہ ہوگا۔ وہ منعم

اچھا ہے جو درویشانہ زندگی بسر کرکے معرفت الٰہی میں مشغول ہو۔ یورپ مال حلال اور حرام میں تمیز نہیں کرتا۔ کمزوروں کی روٹی چھین لینا اس کی عین حکمت ہے۔ اس دنیائے خیر و شر میں نفع اور ضرر میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے شرع پیغمبر پہ عمل کرنا چاہئیے۔ جس کا حکم عدل، تسلیم اور رضا پہ منحصر ہوتا ہے۔

پس شریعت پر عمل پیرا ہوکر احسن التقویم اور وارث ایمان رہنا چاہئیے۔ طریقت کے معنی شرع کو زندگی کی گہرائیوں میں دیکھنا چاہئیے۔ اپنی فطرت میں غوطہ لگاکر اسرار دین کا ملاحظہ کر۔ مرد حق بن۔ ظن اور تخمین سے درگزر کر تاکہ تو جبرئیل امینؑ سے بڑھ کر قربت الٰہی حاصل کرے۔ قرآن پہ ناز کرنے والے کو حجرۂ تنگ میں بیٹھنے کے بجائے اشاعت دین میں کوشش کرنی چاہئیے۔ شیخ مکتب بندۂ ہوس ہیں۔ ان سے کسی فائدے کی توقع مت رکھ۔ بلکہ اپنے عمل سے حق کو اپنے تصرف میں لا۔

## اشکے چند بر افتراق ہندیاں وطن پرستی کے جذبات

کا آئینہ ہے۔ جس میں ہندوستانیوں کی غلامی اور زبوں حالی کو محروم آرزو ہونے کا سبب قرار دیتے ہیں۔

اس موقع پر بارگاہِ ایزدی میں صاحبِ دل کی تخلیق کی دعا کرنی چاہیئے۔ جس کے آگے نو آسمان سرنگوں ہوجائیں۔ اور جو زمانہ سے برسرِ پیکار ہوکر زندۂ جاوید رہے۔ درویش کے سوا کسی اور کو ایسا دل عطا نہیں ہوتا۔ جو خود نگر اور مستِ صحبتِ الٰہی ہو چاہیئے کہ ایسے صاحبِ دل کا دامن مستحکم پکڑ کر آزادی حاصل کریں۔

## ملوکیت کے زیرِ اثر خودی سے غفلت

سیاسیات حاضرہ میں جمہوریت کے زیرِ نقاب ملوکیت پوشیدہ ہے۔ چاہیئے کہ اس دھوکہ بازی سے آگاہ ہوکر اپنی خودی سے غفلت نہ کریں۔ فی زمانہ کوئی بادشاہ نورِ جاں سے آشنا نہیں ہے۔ ایسے بادشاہوں کے زیرِ فرمان رہنا بے دینی کی دلیل ہے۔

افسوس قوم نے خودی سے چشم پوشی اختیار کرکے غیر اللہ سے دل لگا لیا۔ پہاڑ تنکا بن گیا۔ اور ہوا اس کو اڑا لے گئی۔ پھر نہ تو لا الٰہ کا سوز باقی رہا اور نہ وہ اشتیاق۔ پس اے مسلمان عمل سے محظوظ ہو۔ پہاڑ کے مانند ضبطِ نفسی کی بدولت سخت ہوجا۔ اور محبتِ پیغمبری کو اپنا شعار بنا۔ جلوۂ حق صرف مردِ آزاد ہی ملاحظہ کرسکتا ہے۔ غلاموں

کو اس کے جلال کی خبر نہیں ہوتی۔ اور نہ اس میں لذتِ ایمان باقی رہتی ہے۔ مسلمانوں کی نماز سوزِ حیات کے ساتھ معراج بنجاتی ہے۔ ورنہ رسمی محض ہے۔ احرار کی حمیت خفتہ اور دین کی شان و شوکت اور غلاموں کی عبدیت ہجوم محض کے سوا کچھ اور نہیں۔

امتِ عربیہ سے خطاب کرتے ہوئے، اسلاف کے کارنامے دہرا کر اور اپنی خودی کو فنا کرکے بیگانوں کی تقلید کرنے پر ان کو ملامت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں مطالعہ آفاق تو مردِ حر کے لئے امر لازمی ہے۔ لیکن فرنگیوں کے لئے یہی علم اوصافِ ذمیمہ کا باعث ہوا ہے۔ پس تقلید کے طلسم لامذہبی کو توڑ کر روحِ مشرق کو اپنے جسم میں زندہ کر دینا چاہیئے۔

عقل تابع دل ہوکر یزدانی اور دل سے آزاد ہوکر شیطانی ہوجاتی ہے۔ وہ اہلِ مشرق کو ابھارتے ہیں کہ وہ یورپ سے آزاد ہوکر اقوامِ کہن کی شیرازہ بندی کرکے صدق و صفا کا علم بلند کریں۔ غیروں کی اشیاء سے بے نیاز ہوجائیں اور مردِ حر کی طرح اپنی چیزوں کو آپ استعمال کریں۔ حیف در حیف کہ دریا اپنے موتی غواصوں سے خریدے۔

خاتمے پر اقبالؒ حضور رسالت مآبؐ میں قوم کی

زبوں حالی بیان کرکے اس کو از سرِ نو زندگی عطا ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ اور ایک بندۂ خدا کے ظہور کے طالب ہوتے ہیں۔ اور اپنا عشق و محبت۔ سوز و گداز بیان کرکے نزہت پیغمبریؐ کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں آپ کے سیاحت افغانستان کے زمانے کی لکھی ہوئی نظموں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر صوفیانہ انداز رکھتی ہیں۔ ابتداء میں نادر شاہ کو مجسمۂ خسروی اور درویشی کہہ کر فرماتے ہیں۔ فقر و شاہی شعار مصطفٰےؐ تھے۔ در اصل ان صفات کے مرکب سے وجود مومن کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

فقر و سوز و درد و داغ و آرزوست
فقر را در خوں تپیدن آبروست

اقوام سرحد کو دین مصطفٰےؐ کی معرفت کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ عارف خودی کا دل خیر و شر کی رزم میں استوار، ذکر اس کی شمشیر۔ اور فکر اس کی سپر ہوتی ہے۔ لہذا قرآن اور احادیث کے مطالعے کے بعد خود پر نظر کرو۔ اور دل سوزندہ کی تلاش میں زندہ جاوید ہو جاؤ۔ دوسروں کے دوش کا بوجھ مت بنو اور چرخ ستمگار کے شکوے سے

پرہیز کرو۔ اور مقام ذوق و شوق سے آگاہ ہو جاؤ۔ آرزو سلطان اور میر کا سرمایہ ہے۔ جس سے آدم خاکی انسانیت کا راز دار بنتا ہے۔ اور ذرے کو پہنائے گردوں عطا ہوتا ہے۔ ہم کو چاہیئے کہ اپنے جسم میں خودی کو تعمیر کرکے خاک کو اکسیر بنا دیں۔

پھر مسافر شہر کابل میں وارد ہو کر اعلیٰ حضرت شہید اور شاہنشاہ کے مزاروں پر نغمۂ پُرسوز گاتا ہوا غزنی کی طرف جاتا اور مزار حکیم سنائی کی زیارت کرتا ہے اور ملت کی زبوں حالی بیان کرتا ہے۔ حکیم سنائی کی روح جواب دیتی ہے۔ ہیں بوجہ فقر، خیر و شر کا راز داں۔ صاحب فکر اور زندۂ جاوید بن سکا عارف راہ فقر نور خودی سے خدا کو دیکھتا ہے۔ اور اپنے دل میں لا الٰہ کا جلوہ ملاحظہ کرتا ہے اور زیر شمشیر لا الٰہ کہتا ہے۔ کائنات خون دل کے ایک قطرے سے مسخر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی عشق سے ہے۔ خواب و خور سے نہیں۔ عشق و مستی آفتاب کی شعاعیں ہیں۔

بوعلی سینا کی دانائی آب و گل تک محدود اور درد دل سے بے خبر ہے۔ پس اے مسلمان سوائے راہ حق کے دوسری راہ پہ گذر مت کر اور اس کی رحمت عامہ سے مایوس مت ہو۔ پھر سلطان محمود

کے مزار پر پہنچا اور شہر غزنی کی زبوں حالی پر ماتم کرتے ہوئے دیرانۂ غزنین میں مناجات کرتا ہے۔ بار الہٰا! ہم پر سکون و جمود حاوی ہے۔ مسلمانوں کو پھر جذب دروں اور جنوں عطا کر۔ اور ان کے وجود سے مشرق کو استوار کر دے۔ قندھار جاکر اور خرقۂ مبارک کی زیارت سے مشرف ہوکر ایک وجد آور نغمہ گاتا ہے۔ اس کی ایک بیت بطور نمونہ مندرجۂ ذیل ہے :-

از دیر مغاں آیم بے گردش صہبا مست
در منزل لا بودم از بادہ الا مست

عالم مستی میں عشق کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ یہ حکیم کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کسی فقیر کا دامن پکڑنا چاہیئے۔ احمد شاہ بابا موسس ملت افغانیہ کے مزار پر ان کی روح شاعر سے ہم کلام ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں کو خودی اور گرمی ہنگامے کی تلقین کرتی ہے۔ بادشاہ اسلام ظاہر شاہ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں۔ مرد میدان اللہ ھو سے زندہ ہے اور عالم چار سو اس کا پابوس ہوتا ہے۔ ما سوی اللہ سے محبت نہ کرنے والے شخص کے شیشے سے پتھر ٹوٹ سکتا ہے۔

قرآن مجید سے بہرہ ور ہونے کی ہدایت کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ میرے تب و تاب کے تم بھی حصہ دار
بنو کیونکہ میرے سینے میں لا الٰہ کا نور اور
اس کی شراب کا سرور پوشیدہ ہے۔ اگر تم نے
اس شراب کے ایک دو جام نوش کر لیے تو مثل
مینا سبو بجام چمک اٹھو گے۔

الغرض آپ کی یہ کتاب بھی وہی دعا اور
ناصحانہ پہلو لیے ہوئے ہے۔ جو اس زمانے میں
آپ کی شعر و شاعری کا شعار رہا ہے۔

# ضربِ کلیم

یہ کتاب اقبالؔ کے زمانۂ حیات میں ہی شایع ہوئی۔ ضربِ کلیم اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے جو اقبال کے زمانہ حیات میں شایع ہو سکی۔ اس میں متعدد عنوانات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں (۱۸۲) مختلف عنوانات پر نظمیں ہیں۔ لیکن یہاں صرف وہ نظمیں ہمارے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ جو تصوف سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے اکثر مضامین کی تفصیل باب چہارم میں خودی۔ مرد حر۔ عشق وغیرہ عنوانات کے تحت کی جائیگی۔

کتاب مذکور حسب ذیل ابواب پر منقسم ہے اسلام اور مسلمان۔ تعلیم و تربیت۔ عورت۔ ادبیات فنون لطیفہ۔ سیاست مشرق و مغرب۔ محرابِ گل افغان کے افکار۔ کتاب کی ابتداء میں قارئین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں جب تک تو حقیقت زندگی سے آگاہ نہ ہو تیرا شیشہ حریفِ سنگ نہیں ہو سکتا۔ دنیا زور دست اور ضرب کاری کا مقام ہے۔ اس

ذاتۂ جنگ سے کام نہیں نکل سکتا۔ دل اور جگر کے خون سے زندگی کا سرمایہ حاصل ہوتا ہے اور فطرت لہو میں ڈوبی ہوئی ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی تفسیر صوفیانہ انداز میں اس طرح کی ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ خودی کا راز اور تیغ خودی کا فسان ہے۔ فرماتے ہیں

یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب و سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

مال و دولت اور دنیاوی رشتہ داری وغیرہ گمان ہیں۔ خرد زماں اور مکاں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی سب کچھ اور قید زماں اور مکاں سے آزاد ہے۔

افسوس آج کل مسلمانوں نے اپنے عمل میں "تن بہ تقدیر" کو جگہ دی ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر نہاں ہوتی تھی۔ ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام پیام بھیجتے ہیں۔ اگر تو اپنی خودی کو نہ کھوتا تو کیوں برگساں کا پیرو بنتا۔ اور کس طرح ہیگل کے طلسم خیالی سے اثر پذیر ہوتا۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار ذوقِ عمل کو برباد کرنے والے ہیں

مسلمانوں کے زوال کے متعلق فرماتے ہیں. اگرچہ زر بھی قاضی الحاجات ہے لیکن فقر سے جو دولت میسر آسکتی ہے تونگری سے حاصل نہیں ہوتی فرماتے ہیں :-

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تونگری سے نہیں

عشق سے گرمئی کائنات. تماشائے ذات. سکون و ثبات. حیات و ممات وابستہ ہیں. سلطنت و فقر و دیں عشق کے معجزے ہیں اور یہی مکان و مکیں. زمان و زمیں ہے. افکار رومیؒ اور عطارؒ کمال ذکر کا نمونہ اور بو علی سیناؒ کے مقالات کمالِ فکر کی مثال ہیں.

**توحید** فی زمانہ عقیدہ توحید ایک مسئلہ علم کلام بنا ہے اگر کردار انسانی پر اس کا اثر نہ ہو تو مسلمان اپنے مقام سے انجان ہی رہے گا.

اسلام کا دوسرا نام فقرِ غیور ہے.

روح اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لیۓ نارِ خودی نور و حضور

حیات ابدی خودی کی پرورش اور معرفت سے حاصل ہو سکتی ہے. زندگانی صدف اور خودی قطرۂ نیساں ہے

چاہیئے کہ صدف زندگی اس قطرۂ نیساں کو گوہر بنا دے
صوفی سے خطاب کرتے ہیں۔ اے صوفی! تو معجزات کی
دنیا کے نظارے میں غرق ہے۔ لیکن میں دنیا سے
حادثات کے دیکھنے میں محو ہوں۔ تیرے لئے دنیا سراب
اور میرے لئے حقیقت ہے۔ تصوف کے عنوان سے
تحت فرماتے ہیں۔ حکمت ملکوتی یا عالم لاہوتی اس
کے درد دل کا مداوا ہونا چاہیئے۔ ذکر نیم شبی اور مراقبے
اور سرور اگر تیری خودی کی پاسبانی نہ کریں تو یہ حقیر
ہیں۔ عقل بغیر شورش باطنی کے بے حقیقت ہے۔ زباں
سے لا الہ کہنا کافی نہیں بلکہ دل اور نگاہ مسلمانی
ہونی چاہیئے۔

## صوفی اسلام

ملت کی زندگی وحدت افکار سے ہو
اور اسکی حفاظت قوت بازو سے
ہو سکتی ہے۔ اگر تجھ میں ہمت نہیں تو غار میں بیٹھ کر
مسکینی۔ محکومی۔ اور نا امیدی کے تصوف پر عمل کر۔ عقل
امامت کے لائق نہیں۔ کیونکہ ظن اور تخمین کی رہبری
تباہی حیات کا باعث ہوتی ہے۔ جس کی فکر بے نمود اور
جس کا عمل بے تمیز ہو، اس کی تاریک شب حیات کے
ساتھ مسعود ہو سکیگی۔

فی زمانہ صوفیوں میں جد و جہد کا شوق باقی نہیں
رہا۔ اور انھوں نے شراب الست کو بے عملی کا بہانہ بنالیا

ہے۔ عقل کا غلام کل زمانہ ہے۔ لیکن دل کو اسکی غلامی نہیں بھاتی۔ یزداں اور ابلیس کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ اور ابلیس کے انکارِ سجود پر خدا کو ذمہ دار ٹھہرانے پر خدا کہتا ہے۔

وے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

فرماتے ہیں۔ فطرت میں بے تابی اور نشو ونما کی خواہش ہے۔ یہی اقتضائے فطرت ہے۔ پس لے انسان تو بھی فطرت کے خلاف راہِ عمل مت اختیار کر۔ اگر تجھ میں نشو و نما کی ہمت ہے تو ملکِ خدا کو تنگ نہ پائے گا۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ تعلیم و تربیت سے متعلق ہے فرماتے ہیں زمانۂ حاضر میں انسان عقل کو فرمانِ نظر کے تابع نہ بنا سکا۔ جس نے خودی کو افلاک سے بالاتر سمجھا وہی صاحبِ نظر ہے۔

روح کی پاکیزگی کے بغیر ضمیر پاک۔ خیال بلند اور ذوقِ لطیف ناپید ہو جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

سلطان ٹیپو کی آخری وصیت ہے۔ تو شوق کے راستے

کا سالک ہے۔ منزل کو قبول مت کر۔ کائنات کی عقل کو سوز و گداز سے بھر دے۔ لیکن گرمیٔ محفل کو قبول مت کر۔ وہ دل جو عقل کا غلام ہو اس کو قبول نہ کر۔ باطل میں دوئی اور حق میں وحدت ہے۔ تو نہ حق میں شوکت کو پسند کر اور نہ باطل کو قبول کر۔

ہندی مکتبوں میں خودی کے علم کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے اور اس کے احوال و مقامات بچوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ مروجہ تعلیم غلاموں کے لئے بہتر ہے۔ اس لئے خاموش رہنا چاہئے۔ مشرق اور مغرب دونوں نفی خودی میں متفق ہیں۔ روح عرب میں بھی خودی کی موت سے اگلی سی تاب و تپش نظر نہیں آتی۔ عراق و عجم بھی ساکن ہیں اور ہندوستانی تو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہیں اور مسلمانوں میں لا مذہبی پھیلی ہوئی ہے۔

طالب علموں میں اضطراب نہیں رہا۔ اس زمانے کی ہوا ہر شے کو ناقص بنا رہی ہے۔ بغیر اخلاق حسنہ کے دعوئی نظر محض یاوہ گوئی ہے۔ خودی سے محروم قوم کی تقدیر میں محکومی اور مظلومی لکھی ہوئی ہے۔

جاوید سے فرماتے ہیں کہ مردانِ خدا کا آستانہ دربار شاہی سے خوش تر ہے۔ مغربی تعلیم کے باوجود پرستار توحید کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوتا۔ خودی میں اپنا مکان بنا لے اور چہکنے کے لئے کبھی شاخ و گل پر آ جایا کر۔

زارع آرام پرست نہ ہو تو ایک دانے سے سو ہزار دانے حاصل کر سکتا ہے۔

تپشِ دل تحصیل مقصدِ حیات کا ذریعہ ہے۔ غیرت فقر کو کلکِ کمال بنا دیتی ہے۔ اور صدق گفتار باعث توقیر ہے۔ اگر ہمت ہو تو حجازی فقر کا متلاشی بن جو انسانوں کو امارت بخشتا ہے۔

تیسرا حصہ عورت کے باب میں ہے۔ جس میں پردہ آزادیٔ نسواں اور تعلیم پر ان ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جس کا ذکر رموزِ بیخودی کے تذکرے میں آچکا ہے۔

چوتھا حصہ ادبیات فنونِ لطیفہ کے متعلق ہے۔

فرماتے ہیں قوتِ تخلیق خودی کی معرفت سے پیدا ہوسکتی ہے۔

ادب وہ ہو جو کہنہ پیکر میں نئی روح کو آباد کر دے اور روحِ کہن کو تقلید سے آزاد کر دے۔ فی زمانہ ادبیات اور فنونِ لطیف انسان کو خودی سے بیگانہ کر رہے ہیں تاہم ایک شعاع امید بھی اس فضا کو روشن کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔

نگاہِ شوق کا کرشمہ یہ ہے کہ اگر یہ بینائی کی شریک ہو تو دنیا میں انقلابِ عظیم برپا ہو جائے۔ اس نگاہ میں قاہری۔ جباری۔ دل بری۔ رعنائی۔ جنوں اور حکومت کے اسرار پوشیدہ ہیں۔

عنی نے رمز دل کو سمجھ کر گایا تو اس کا ہنر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ ذوقِ نظر سے تو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاہم حقیقت کو دیکھنے میں کچھ اور ہی لذت پوشیدہ ہے۔ ہنر کا مقصد فوری مسرت نہیں، بلکہ حیات ابدی کے سوز کو محسوس کرنا ہے۔ صبح شبنم سے نہتی ہے۔ کہ تجھے کوہ و بیابان سے ہم آغوش ہونا چاہیئے۔ لیکن افلاک کے دامن کو ہاتھ سے مت چھوڑ

اگر مشرقیوں نے اپنی قواء پوشیدہ کو آشکار کیا تو دنیا انگشت بہ دنداں حیرت رہ جائے گی۔

تو کیوں اغیار کے افکار و تخیل کا سائل ہے۔ خود ہی اپنی خودی تک کیوں رسائی نہیں کرتا۔ جلال جمال کی زیادتی کو محسوس کرنے کے لیئے ضروری ہے نغمے میں حرارت نہ ہو تو نفس محض ہی ہو گا۔

گو کہ مصور نے فطرت کی نقشہ کشی کی کوشش کی ہے لیکن چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ آئینہ فطرت میں اپنی خودی کو بھی دکھاتا۔

وہ موسیقی جلال آمیز ہے جس کی گرمی سے ستاروں کا وجود پگل جائے اور انسان رنج و حزن سے دور ہو اور اس کو غلامی سے بادشاہت کی طرف لے جائے اور اس کو حضوری نصیب ہو فرماتے ہیں غلاموں کیلئے شاعری مناسب نہیں شعر کے لئے

صرف طرب ناک ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس میں وہ زور بیان ہونا چاہیئے جس سے سلطنت پرویز بھی لرز جائے۔ زندہ دل شخص تقدیر کو جاننا اور عالم نو کی تصویر کو خواب میں ملاحظہ کرتا ہے۔ ایجاد معانی کی فکر کرنی چاہیئے۔ تاکہ شعر حیات ابدی کا پیغام ہو جائے۔ رقص جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس میں ضرب کلیم پوشیدہ ہو۔

چوتھا حصہ سیاست مشرق اور مغرب کے ........ متعلق ہے جس میں مختلف عنوانات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

مشرق و مغرب کو سوز و ساز حیات سے محروم سمجھ کر ایک کو خودی کی موت اور دوسرے کو ضمیر کی موت قرار دیتے ہیں۔

فرماتے ہیں سلطانیٔ جاوید عشق اور خارا شکنی کی بدولت فرہاد کو حاصل ہوئی۔ پرویز کو نہیں۔

ترکی وفد لاہور میں ایک نماز میں شریک ہوتا ہے۔ اور ہندیوں کے طویل سجدہ کی حقیقت دریافت کرتا ہے۔ اقبالؒ جواب دیتے ہیں کہ غلام کے بدن میں سوز عمل جائے گیر نہیں ہوتا اور اس کو سوائے قولی عبادت کے کوئی دوسرا کام نہیں۔ لہذا یہ کیوں طویل سجدہ نہ ہو۔

"محراب گل افغاں کے افکار" کتاب کا آخری حصہ ہے ۔ جس میں فرماتے ہیں " قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش جس نے ڈھونڈھی سلطان کی درگاہ زمانہ صاحب ایجاد کا طواف کرتا ہے ۔

تمام دنیا بدل رہی ہے تو بھی اے افغان بدل اور اپنی خودی کو پہچان ۔ عالم و فاضل جو اپنی خودی کو بیچ رہے ہیں اس سے تیری فقدان عملی ہی بہتر ہے ۔ ہوس کی طرح عشق عاجز نہیں ۔ دل کی پرورش کے لئے کسی مرد مومن کی نگاہ غلط انداز کا طالب ہو ۔

خودی خلوت گزینوں سے ظاہر نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ شعلۂ نم خوردہ ہیں ۔ ان سے شرر نکلنے کی کیسے امید ہوسکتی ہے ۔

عشق اگر جرأت رندانہ سے محروم ہو تو روبائی ہے عشق تقویت بازو کا ذریعہ ہے ۔ اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ معرفت خودی کے لئے خلوت گزینی جائز ہے ۔

فقیر کو خود دار ہونا چاہئے ۔ غیرت امارت کی تمہید ہے ۔

اقوام کا اپنے مرکز سے جدا ہونا ان کی تباہی کا موجب ہوتا ہے ۔

اگر فقر زمانہ کا شکر گذار ہو تو اس میں بوئے گدائی

کے باقی رہنے کا نشان ہے۔

کبھی کبھی کوہ و دشت کے باشندوں میں بھی فقیر پیدا ہوتا ہے۔ جس کی صحبت خزف کو نگین بنا دیتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ تقدیر کو تدبیر سے تشکیل دے۔

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

صحرا و کوہستان کے باشندے ہی عزت اسلامی کے پاسبان ہوتے ہیں۔ اور ان میں فاروقؓ اور سلمانؓ کی پیدائش ممکن ہے۔

اقبالؒ کے زمانۂ حیات کی یہ آخری تصنیف ہے۔ اس کے بعد شعر و سخن کے اس تاجدار نے دنیائے فانی سے منہ موڑ لیا۔ تاہم جبتک دنیا میں مسلمان کا وجود باقی رہیگا اقبالؒ کا نام بھی زندہ رہے گا۔

---

# ارمغانِ حجاز

"ارمغان حجاز" فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ پہلے حصے میں فارسی نظمیں ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں آپ کا اردو کلام ہے۔ پہلا حصہ حضور حق۔ حضور رسالت۔ حضور ملت

حضور عالم انسانی۔ یہ یاران طریق پر مشتمل ہے۔ اور دوسرے حصہ میں مختلف عنوانات کے تحت میں متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔ حضور حق کی ایک رباعی میں فرماتے ہیں، میں اس دنیا یا اس دنیا کو نہیں جانتا۔ صرف رمز جاں سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں

پس بار الٰہ ایسا سجدہ عطا فرما جس کے سوز و ساز سے زمین اور آسمان وجد کرنے لگیں۔ رومیؒ کا شور اور خسروؒ کا سوز عطا ہو۔ سنائیؒ کا صدق اور اخلاص نصیب ہو۔ مجھے بندگی سے اس قدر انس ہے کہ اس کو خدائی کے عوض دینے پر راضی نہ ہونگا "حضور رسالت" میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا بیان اور ہدایت رجائیت ہے۔ گو کہ اس وقت مسلمان بے فیل و سپاہ ہے۔ لیکن اس کا ضمیر بادشاہ ہے۔ ہمیں اپنی حالت پر ماتم کرنا چاہیئے۔ کہ کیوں ہم تیری شان کے شایاں نہ ہوئے۔

پھر درگاہ رسالت سے ایک ایسی آہ گرم کے خواستگار ہوئے ہیں جس سے سوائے غم دیں کے ہر غم جل جائے۔ فرماتے ہیں۔ درس حکیماں میرے لئے درد سر کا باعث ہوا۔ میں صرف آپکی فیض کا پروردہ ہوں۔ کوئی ملا یا صوفی نہیں۔ میرے قلب پر لفظ **اللہ** لکھ دیجیے۔ تاکہ میں خود کو اور "خدا کو آشکار دیکھنے

لگوں۔

نیز فرماتے ہیں۔ جب میں نے اپنے آغوش میں خود کو ملاحظہ کیا تو آپ کے نور کی روشنی میں اپنے مقام کو پایا۔

دعا کرتے ہیں کہ وہ نوجوانؐ پاک باز جو شراب ساز سے مسرور اور حیدر کے مانند قوی بازو اور دونوں عالم سے بے نیاز ہو۔ خدا کرے ہماری قوم میں پیدا ہو۔ گو کہ میں تیغ علی کے شایاں شاں نہیں۔ شمشیر علی کی طرح میری نگاہ کو تیز کر دے۔ اس عنوان کی آخری رباعی میں فرماتے ہیں۔ صنم خانہ افرنگی سے بیگانہ ہوکر چشم فاروق کی ایک نگاہ اختیار کر اور اس عالمِ نو میں بے باکانہ قدم رکھ۔

حضور ملت کی ابتداء ہی میں کہہ دیتے ہیں کہ مجھ سے عارفانہ کلام کی توقع مت رکھ۔ میری فطرت عاشقانہ ہے۔ اس عنوان کے تحت اکثر نظمیں صوفیانہ گہرائی رکھتی ہیں۔

"بحق دل بند و راہ مصطفٰےؐ رو" کے تحت میں فرماتے ہیں۔"خودی کو مضبوط پکڑ" اور خوش رہ"۔ کسی کے ہاتھ میں اپنی تقدیر کو مت دے۔ خودی کی بدولت انسان کامل ہوتا ہے۔ اور خودی کی تباہی غلامی کا موجب ہوتی ہے۔

فراتے ہیں۔ در اصل خدا اس ملت کو سرداری عطا فرماتا ہے۔ جو اپنے ہاتھ میں اپنی تقدیر رکھے۔

خودی کے متعلق فرماتے ہیں جس نے خودی پر لا الٰہ کی مہر لگادی گویا کہ خاک مردہ میں جان پیدا کردی۔ ایسے مرد کامل سے دست بردار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس کے ذریعے دلِ آگاہ حاصل کرکے اسرار پنہاں کو ملاحظہ کرنا چاہیئے۔ انا الحق صرف اولیاء اللہ کا مقام ہے۔ فرد کا ایسا کہنا موجب سرزنش ہو تو ہو لیکن قوم کا ایسا کہنا ناجائز نہیں در اصل ایسا کہنے والی قوم دو جہاں میں امامت کرتی ہے۔ اور مقصدِ آفرینش سے کبھی غافل نہیں ہوتی۔ نیز خواب و خستگی اس پر حرام ہوجاتے ہیں۔

صوفی اور ملاّ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے بند میں کوئی اسیر ہوجائے تو حکمتِ قرآنی سے حیات پا نہیں سکتا۔ ان کی تاویل خدا اور جبرئیلؑ کے لئے باعثِ حیرانی ہے۔

اقبال مولانا رومیؒ کے اشعار کو حریم دل کی دیوار سے آویزاں کیے جانے کے قابل سمجھتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ میں اس پاکباز "نے نواز" کی وجہ سے عشق اور مستی کے رموز سے آگاہ ہوا اور تسخیر کائنات پر ایمان لایا۔ پس رومی سے اسرار

فقر کو سیکھنا چاہتے ہیں۔ جن کی فقیری امیروں کے حسد کا باعث ہوئی۔ الغرض مجھے وہ آتش نصیب ہوئی ہے جس کو سنائیؒ نے قلب رومیؒ میں روشن کیا تھا۔

حضرت عمرؓ۔ فاروق مصر کو پیام دیتے ہیں کہ فقر اور سلطانی کو اپنا شعار بنا.... کیونکہ خلافت فقر اور اور بادشاہی کا مرکب ہے: اور فقر کی آمیزش کے بغیر بادشاہی جلد ختم ہو جانے والی ہے۔ پس جہانگیری اور امامت مسلمانوں کا فطری حق ہے۔ اے بادشاہ اپنے دل میں اس دنیا کو ملاحظہ کر جس کا فاروق نے بیج بویا تھا۔

شعرائے عرب سے فرماتے ہیں۔ مسلمان صفات الٰہی کا حصہ دار ہے اور اس کے قلب میں ذات الٰہی کے اسرار پنہاں ہیں۔ اس کے لئے کوئی ایک ایسا نغمہ گا جس سے اس کے دل میں ذوق انقلاب پیدا ہو۔ دردِ دل میں مبتلا ہونا اور اپنے ہم جنسوں کی محبت میں سیماب وار تڑپنا اور ملت کے لئے خود سے در گزر کرنا ضروری ہے۔ یہاں اقبالؒ شاعر ملت کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں۔

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ایک نظم کا عنوان قرار دے کر فرماتے ہیں

اے ملت بحر آئین تسلیم و رضا۔ صدق و اخلاص اور وفا کو اپنا شعار بنا اور میری طرح جنوں آمیز زندگی کو اکتساب کر۔ جان لے کہ کبھی کبھی کسی پریشان قوم میں کوئی صاحب بصیرت شخص پیدا ہوجاتا ہے۔

فرماتے ہیں خلافت اور ملوکیت میں فرق یہ ہے کہ خلافت ناموس الٰہی کی حفاظت ملوکیت مکر اور نیرنگ ہے۔ دختران ملت فاطمہؓ زہرہ کو اپنا نمونۂ عمل بنائیں۔ عصر حاضر نوجوانوں کے لئے بد آموز ہے۔ دین و دانش کی تعلیم اور اکتساب ہنر احسن ہے۔ لا الٰہ پر عمل ہونا چاہیئے۔ نہنگ کے مانند ساحل سے پرہیز کرکے طوفان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

حضور انسانی میں فرماتے ہیں:۔

آدمیت احترام آدمی باخبر شو از مقام آدمی

خدا کو دیکھنا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو فاش تر دیکھنا سیکھ لے۔ سختی ایام کا گلہ گذار مت ہو۔ سختی نا دیدہ شخص ناقص رہتا ہے۔ فقیر خود بیں امیر ہے۔ حیات جاوداں یقین کے اندر پنہاں ہے۔ اپنا بوجھ دوسروں پر مت ڈال۔ تخمین اور ظن سے چھوٹ جا ملاؤں کے تاویلات سننے کے بجائے تصور خودی میں کچھ لمحے صرف کرنا بہتر ہے۔ آرزو سینے میں زندہ رکھ۔ روشنی فردا میں امروز کو ملاحظہ کر۔ رنج و آرام سے

پست حوصلہ مت ہو۔۔۔۔۔۔ مرد کامیاب کبھی فنا ہو نہیں سکتا۔ اپنی پاک دامنی کی خاطر تقدیر کو اپنی سیاہ کاریوں کا ذمہ دار ٹھرا۔ دل سے کینے کو دور کر۔ دل وہ بحر ہے جو ساحل کو قبول نہیں کرتا۔ جس کی موج کی ہیبت سے نہنگ لرزہ بر اندام ہے

جس طرح دریا اپنے گوہر کی حفاظت کرتا ہے تو اپنے دل کا پاسباں رہ۔ غلاموں کا دل بیداری نا آشنا ہوتا ہے۔ خدا کی کھیتی انسان ہے۔ ایک جگہ ابلیس اپنے پیروؤں سے کہتا ہے، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ یہ امت احکام قرآن پہ عمل پیرا نہیں اور یدبیضا سے محروم ہے۔ لیکن ایک زمانے میں اسکی تکبیروں نے شش جہت کے طلسم کو توڑ ڈالا تھا۔ لہذا تم اس کو کردار سے بے گانہ کردو۔ تاکہ یہ شعر و تصوف میں مشغول ہوکر تماشائے حیات سے محروم ہو جائے۔ اور ذکر و فکر اس کو رہبانیت کی طرف متوجہ کردیں۔ مجھے اس امت کی بیداری کا ڈر ہے

ایک بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے، کہ سیل رواں کی طرح راستہ طے کرتا جا۔ غیرت کو اپنا شعار بنا۔ اللہ سے اخلاص عمل کا متمنی ہو۔ ملت سے پیوستہ رہ۔ تصویر اور مصور کے مکالمے میں تصویر مصور کو دیکھنے کا مطالبہ کرتی ہے تو مصور کہتا ہے تو میرے کمالات ہنر کا نمونہ ہے۔ لہذا میری دید سے مایوس نہ ہو۔ لیکن میری دیدار کی شرط یہ ہے کہ تو اپنی نظروں سے خود

کو پنہاں نہ کرے۔

قبر اور مردے میں قیامت کے متعلق گفتگو ہوتی ہے اور صدائے علیی سنائی دیتی ہے۔

مرکے جی اٹھنا فقط مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہو آغوش لحد

اور قبر مردے کو اس کے محکوم ہونے پر ملامت کرتی ہے۔ اور غلام کی میت سے الاماں پکار اٹھتی ہے۔

راس مسعود مرحوم کی وفات پر آپ مرثیہ لکھتے ہوئے طلسم دنیا کا ذکر کرکے اپنے خاص فلسفہ خودی کے متعلق لکھتے ہیں۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت ایک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بے کرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موج نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانند کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات

اردو نظموں کا دوسرا حصہ رباعیات پہ مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں:-

ذکر کوں عالم شام و سحر کر
جہاں خشک و تر زیر و زبر کر

رہے تیری خدائی داغ سے پاک
مرے بے ذوق سجدوں سے حذر کر

نماز کے متعلق فرماتے ہیں:۔

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

آگے وہ خودی کی تنگ دامنی اور تجلی کی فراوانی کی شکایت کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں انسان کو سخت ہونا چاہئے۔ کیونکہ کانٹا اگر خوئے حریر اختیار کرلے تو گل کی پاسبانی کیسے کر سکے گا۔ اس لئے مسلمان اپنے دریا میں طوفان برپا کرے۔ کیوں تو تقدیر کی شکایت کرتا ہے اور کیوں تو خود ہی تقدیر یزداں نہیں بن جاتا۔ دراصل دنیا نور لا الٰہ سے منور ہو رہی ہے۔

"بعنوان" ملا زادہ ضیغم لولابی ..... کشمیری کا بیاض فرماتے ہیں عارف آزاد۔ خودگیری، خودداری اور اناالحق کی آواز سے آگاہ ہے۔ اور محکوم سالک ہمہ اوست کہہ کر ختم ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
تیرے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری

انسان کا دل لہو کی بوند نہیں بلکہ ایک جذبہ بلند ہے

اقوام زندہ کا عمل عالم کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔

فرماتے ہیں :-

خودی ہے مرد خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

اس وقت مدرسۂ حرم میں نہ دل جنیدؒ ہے ، اور نہ نگاہ غزالیؒ اور رازیؒ۔

مشرق اور مغرب کا فرق اس طرح بیان کرتے ہیں

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ یہاں بدلتا نہیں زمانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

مسلمانوں سے کہتے ہیں :-

آں عزم بلند آور آں سوز جگر آور
شمشیر پدر خواہی بازوئے پدر آور

رسالہ "سب رس" کے اقبال نمبر میں آپ کا آخری کلام مندرج ہے :-

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست
بہشتے بہر پاکاں حرم ہست
بگو با مسلم ہندی کہ خوش باش
بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

آپ کا آخری شعر ہے :-

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

آخری قطعہ :-

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

در اصل اس پیغمبر سخن کے کلام میں خیالات اور الفاظ کی وہ خوب صورت آمیزش ہوئی کہ آپ کی نظیر بہت مشکل سے ملسکتی ہے۔ میدان سخن کے اس شہ سوار نے کبھی الفاظ کی بندشوں اور خوبصورتی کے لیے معنوں میں تضاد ہونے نہ دیا۔

آپ کی شاعری کل لوازمات لفظی اور معنوی سے آراستہ اور آپ کے خیالات منطق کسوٹی پر بدوں تضاد و نقص ٹھیک اترتے ہیں۔ سچ ہے :-

شاعری جزویست از پیغمبری

اردو ادب کبھی آپ کے احسانات سے سبکدوش نہیں ہوسکتا اور نہ انسانیت آپ کے خیالات اور تعلیمات کے تشکر سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔

آپ کے تعلیمات کا ذکر چند جداگانہ عنوانات

کے تحت میں آئندہ باب میں کیا جائے گا ؎

# باب چہارم

## سر اقبالؒ اور فلسفۂ خودی

(فلسفۂ خودی سر اقبالؒ سے خصوصیت رکھتا ہے آپ نے اس اصطلاح کو نہایت ہی عمیق اور وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ استحکام خودی انسان اور ملت کا ذریعہ حیات ہے۔ عقیدہ نفی خودی جو ہندوؤں اور ان کے فلسفے کے اثر کی وجہ سے بعض صوفیوں کا عقیدہ ہوگیا ہے افراد اور ملّت کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔)

آفرینش کی کل چیزوں میں شعور اور ارادے کی قوتیں پوشیدہ ہیں جو بتدریج ترقی پاکر انسان میں ظاہر ہوتی ہیں چونکہ انسان کی خودی کو خود اپنا اور اپنے مقصد کا شعور ہے۔ لہذا اس کی زندگی حقیقی اور سب اشیاء سے ممتاز ہے۔ پس انسان کو چاہیئے کہ اپنی قوار پوشیدہ کو ظاہر کرے۔ ان کے اظہار کے لحاظ سے افراد میں خودی کم اور زیادہ ہوسکتی ہے۔ آرزؤں کا نشو ونما اور ان کی تحصیل میں جدوجہد آتش خودی کو تیز کر دیتے ہیں۔ شریفانہ خواہشات خودی کو محکم کرتے ہیں۔ آرزؤں کی بیداری کے

کے بعد چاہئے کہ بے قراری اور مسلسل تڑپ کے ساتھ راہ طلب میں جدوجہد کرے جو عمل پیہم کہلاتا ہے۔ یہ تڑپ اور بے چینی اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ انسان کو اپنے نصب العین سے عشق نہ ہے اور عشق کے لئے مرد کامل کی پیروی ضروری ہے۔ پیغمبر صلعم کامل مرد کی بہترین مثال ہیں۔

پس عشق الٰہی اور پیروئ سنت نبوی استحکام خودی کا موجب ہوتے ہیں۔ لیکن محبت اور پیروی کا مقصد اپنی شخصیت کو فنا کرنا نہیں بلکہ معرفت خودی اور خود شناسی اور خود داری کا اکتساب ہے۔

اسرار خودی میں آپ فرماتے ہیں:-

پیکر ہستی ز آثار خودی ست
ہر چہ می بینی ز اسرار خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ در ذات او
غیر او پیداست از اثبات او
وا نمودن خویشتن را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروی خودی است
چوں حیات عالم از زور خودی است
پس بقدر استواری زندگی است

خودی کو پورے طور پر ترقی دینا چاہیئے۔ کیوں کہ یہ عجیب صنم کی قوتوں کو در پردہ رکھتی ہے۔ چوں کہ یہ زندہ جاوید شئے ہے۔ اس کی محبت سالک کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔

خویشتن را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو
گر بقا خواہی بہ خود آباد شو
در خودی کن صورت یوسف مقام
از اسیری تا شہنشاہی خرام
از خودی اندیش و مرد کار شو
مرد حق شو حامل اسرار شو

اس مثنوی میں بابائے صحرائی کی نصیحت ملاحظہ ہو

غوطہ در خود صورت گوہر زدن
پس ز خلوت گاہ خود سر بر زدن
زیر خاکستر شرار اندوختن
شعلہ گردیدن نظرہا سوختن
خانہ سوز محنت چہل سالہ شو
طوف خود کن شعلہ جوالہ شو
زندگی از طوف دیگر رستن است
خویش را بیت الحرم دانستن است

پیامِ مشرق میں فرماتے ہیں :-

یکے بر خود کشا چوں دانہ چشمے
کہ از زیرِ زمیں نخلے برآئی۔

---

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیمؑ معمارِ حرم شو

زبورِ عجم :-

منہ پا در بیاباں طلب است
نخستیں گیر آں عالم کہ در تست
اگر زیرے ز خود گیری زبر شو
خدا خواہی۔ بخود نزدیک تر شو

بالِ جبرئیل میں فرماتے ہیں :-

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

اس کتاب کی اکیسویں نظم خودی کی تعریف میں ہے - فرماتے ہیں، خودی میں ڈوبنا اور اس بحرِ ناپیدا کنار سے ابھرنا صرف باحوصلہ شخص کا کام ہے۔ عارفانِ خودی کا مرتبہ در اصل سلطان کے برابر ہے۔

خودی میں گم ہو خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

---

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ

---

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی
رائی زور خودی سے پربت
پربت ضعف خودی سے رائی

---

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آشیانہ
اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلربایانہ، کردار قاہرانہ

خودی اگر علم سے محکم ہو تو غیرت جبریلؑ اور عشق سے محکم ہو تو صور اسرافیل ہے۔

ضرب کلیم میں فرماتے ہیں :۔

جس بندۂ حق کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کے مانند ہے بُرّندہ و براق

---

خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

پس آزادی - ارادہ اور خواہش انسان کیلئے

ایزدی عطیے ہیں۔ جن کی بدولت انسان اپنے ساکن قواء کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ اور خلیفہ الٰہی کے نام کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔ آزادی فقر و استغناء خودی کے شرائط ہیں۔ غیر اللہ کے سوا کسی دنیاوی قوت کے آگے سر جھکانا خودی کو کم زور کرنا ہے۔ ترس خداوندی احسن ہے۔ لیکن ماسوی اللہ کا خوف انسانی جوہر کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دوسرو(ں کا) رہین منت ہونا، سوال کی عادت اور دوسرے کی دولت کا استعمال خواہ میراث پر ہی ہے کیوں نہ ہو خودی کو کمزور کر دیتا ہے۔ پس خودی عشق و عمل سے مزین ہوکر ماسوی اللہ کے ڈر سے بے نیاز ہو جاتی ہے، تو کائنات کو مسخر کر لیتی ہے

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرمان دہ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود

انسان اپنی تقدیر کا آپ ہی معمار بن جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تسخیر کائنات کے بعد مدد ایزدی شامل حال ہو جاتی ہے۔ اگر کسی نے خودی کی بڑھنے والی اندرونی

قوت کے خلاف کام کیا تو یہ طاقت پوشیدہ اس میں فنا ہوجاتی ہے۔ اور مادہ مردہ کے سواء اس میں کچھ باقی نہیں رہتا۔

خودی کی تربیت اور تادیب کی اولیں شرط قانون حیات کی پابندی اور اطاعت ہے۔ ضبطِ نفس کا درجہ دوسرا ہے۔ جس میں انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں پر قابو پالیتا ہے۔ اس کے بعد نیابتِ الٰہی کا دوسرا درجہ ہے۔ جو ارتقائے خودی کا مقصد اور مردِ کامل کا مقام ہے۔ جس میں وہ آفاق و انفس پر حکمراں ہوکر نائب خدا و واصلِ حق ہوجاتا ہے۔ پھر بندے اور خدا میں تعلق پیدا ہوتا ہے۔ تکمیل خودی کے بعد ایک یہ درجہ ہے جس پر پہنچنے کا شوق قلب کو بے چین رکھتا ہے اور اس ذوق و شوق کا نام "عشقِ حقیقی" ہے۔ جس سے انسان ذاتِ مطلق کے وصال کا مشتاق ہوجاتا ہے۔ آرزو سے بے تاب ہوکر سرگرم جستجو ہوجاتا ہے۔ اور پھر دیدارِ یار سے محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن وجودِ مطلق میں اپنی ہستی کو فنا نہیں کرتا۔ بلکہ اس ہستی مطلق کا عشق تڑپ اور اس کے حصول کی اَن تھک کوشش نصب العین انسانی ہے۔ انسان کی جستجو اور آرزو بتقاضائے فطرت ہے جس میں شعور۔ ارادہ۔ اور احساس خودی پنہاں موجود ہیں۔ معرفت خودی کے بعد مادیت کا

حجاب دور ہو کر وجود مطلق کے دیدار سے سیراب ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس پر یہ حالت قائم نہیں رہتی جس سے اس کے دل کو تسکین ہونے کے بجائے شوق دید میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور خودی مطلق کو اپنی آغوش میں لے کر تسکینِ قلب حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اس طرح سے عشق کا دریائے بے کنار اور یہ سفر بے منزل ہوتا ہے۔ سر اقبالؒ کے لئے وصالِ حق سے مراد دیدارِ الٰہی ہے۔ جس سے تشنگئ شوق اور بڑھ جائے۔ وصال میں انفرادی وجود فنا نہیں ہوتا بلکہ اس میں نئی شان اور نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال اس قطرے کی سی ہے جو اپنی انفرادیت سمندر میں کھونے کے بجائے گوہر بنکر وہاں رہ جاتا ہے۔ اس سے خودی واضح تر اور روشن تر ہو جاتی اور محدود شے نا محدود کے آغوش شفقت میں چلی جاتی ہے۔ یہ درجہ نیابتِ الٰہی کا ہے۔ اور اس خلیفہ خدا کا روشن قلب اپنے جذبِ شوق کی حالت میں کبھی "انا الحق" کا نعرہ لگاتا اور کبھی "سبحانی ما اعظم شانی" پکار اٹھتا ہے۔

یہ تو افراد کی خودی کا ذکر ہوا جس میں انفرادی بھلائی مقصود ہے۔ لیکن اقبالؒ بمقابلہ افراد کے اجتماعیت کو اہم سمجھتے تھے۔ اور آپ کی مثنوی رموز بے خودی میں ملتِ اسلامیہ کی خودی اور اس کی ترقی پر ایک مدلل و

جاتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیئے کہ آپ کا روئے سخن کسی ایک اور مخصوص قوم یا ملت سے نہیں۔ بلکہ افراد انسانی سے ہے اور آپ نے ملت اسلامیہ کو بطور تمثیل مخاطب کیا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ملت ہے جس میں افراد اور ملت میں اس قدر رشتۂ قریبی پایا جاتا ہے۔ اور اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں رنگ و نسب کی تمیز نہیں اور جس نے اخوت اور مساوات کا اصول دنیا کو سکھا کر محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ تکمیل انسانیت آپ کے مدنظر رہی جس میں جغرافی قیود یا فرد اور ملت میں حسب ونسب اور رنگ کی تنگ نظری کو دور کرنے سے ربط پیدا ہوتا ہے۔ صرف نسبی یا جغرافی اتحاد کافی نہیں۔ جذبات اور مقاصد کا اتحاد ہونا چاہیئے۔ ایک طاقت نا محدود کی پیدائش کا ذریعہ ہے۔ جیسا کہ ایک قطرہ سمندر میں مل کر دائمی زندگی پاتا ہے۔ اس طرح فرد ملت میں فنا ہوکر زندۂ جاوید ہوجاتی ہے۔ ان کی قوتیں منظم اور خودی پائدار ہوتی جاتی ہے۔ اسلام میں نماز جماعت کا مقصد ایک محلے کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے۔ اور عید میں ایک شہر کے لوگ ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں اور حج کے موقع پر کل روئے زمین کے تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہوکر ایک ہی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جس سے

اخوت اور مساوات کی تعلیم مضبوط ہوتی ہے۔ فرد کی انفرادی ہستی نہیں ہوسکتی بلکہ اس کی ہستی کا راز جزو ملت ہونے میں پوشیدہ ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

---

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی
فدائے ملت ہو یعنی آتش زن طلسم مجاز ہوجا

ملت کے بغیر فرد کمزور ہوتا ہے۔ اس کے قوائے عقل منتشر ہوجاتے اور اس کے مقاصد محدود و بے کار ہوجاتے ہیں۔ ملت انسان کے مقاصد کو عمیق اور وسیع کرتی ہے۔ اس کی طاقت کو بڑھاتی اور ارادوں کو متحد کرتی ہے۔ جماعت فطرتاً ترقی کرتی رہتی ہے اس لئے ضرورت زمانہ کے مطابق بنیادی اصولوں میں نہیں بلکہ جزئیات میں اجتہاد ضروری ہے۔ اور زمانے کے لحاظ سے اپنے معاشری قوانین کی اصلاح کرنا چاہئے۔ کہ ملت سائنس کی قدردان ہو اور اس کو رقیب وجدان سمجھنے کے بجائے روحانی ترقی میں اس سے مدد لی جائے۔ دوسرے مذاہب کی عمدہ باتوں کو اختیار کرے لیکن تقلید کورانہ سے احتراز کرے۔ کیونکہ تقلید بھی اس کی خودی کو ضعیف

کرسکے گی۔ مذہب سے غرض حسن اخلاق ہو اور نہ رسمی حرکات کی پیروی۔ علم کے ہمراہ عمل ہو اور اس کی تعلیم قومیت کے حدود سے بڑھ کر اتحاد انسانی کی طرف لے جائے۔ نیز اپنے زمانۂ گذشتہ کی تاریخ و تمدن کا یاد رکھنا اعتماد نفس اور طاقت کی ازسر نو بیداری کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ہجوم خطرات و مصائب میں یادِ گذشتہ نئی قوتوں کو پیدا کرتی ہے عقیدۂ توحید اتحاد انسانی کا باعث ہے۔

اسلام کی اخوت و مساوات کی تعلیم اس کی ممد و معاون ہوتی ہے۔ ملّت اسلامی کا اساس قرآن مجید اور اخلاق محمدی ہے۔ جن کی پیروی ہر مسلم کا اوّلین فرض ہے۔ توحید کا رشتہ دائم اور زندۂ جاوید ہے۔ جو افراد انسانی کو ایک سلسلے میں منسلک کرکے ملّت کو تشکیل دیتا ہے۔ اس روحانی رشتے کے ذریعے افراد مختلفہ ملّتہ واحد بن جاتے ہیں اور ملّت کی زندگی بہ نسبت افراد کے پائدار اور باقی رہتی ہے اس لئے یہ زمان اور مکان سے آزاد ہوکر اپنی خودی کو ترقی دینے میں منہمک ہوجاتی ہے۔ اور اجتماعی خودی کا احساس انفرادی خودی کو مستحکم کردیتا ہے۔ افراد کی خودی کے مانند یہ بھی میدان عمل میں کارفرما ہوکر مصائب و خطرات کا مردانہ وار مقابلہ سے ہنوار ہوجاتی

ہے ۔ اور دنیا خودی کی تربیت کے لئے میدان عمل بن جاتی ہے ۔ ملت کو چاہیئے کہ انفس اور آفاق کی تسخیر اور اپنے زمانے کو اپنے موافق بنا لینے میں مصروف رہے ۔

**کائنات کی خودی** اقبالؒ ہیگل کی طرح شعور کو اصل کائنات تصور کرتے ہیں ۔ شعور سے عقل مراد نہیں بلکہ روح مراد ہے اور عالم ظہور جلوہ ذوق شعور ہے ۔ اس لئے انسان کا عمل جو روح ازلی کا مکین ہے ۔ کائنات کی تسخیر پر خود بخود مائل ہو جاتا ہے ۔ کائنات کی اصل صداقت حسن اور نیکی ہے ۔ اور اس لئے انسان فطرت میں حسن کا مشاہدہ کرکے بے چین ہوا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس لئے قرآن مجید میں مطالعہ نسخہ کائنات کی "تاکید کی گئی ہے ۔

آسمان و زمین کی پیدائش میں روز و شب کی تبدیلی میں ان سفینوں کے دریا پر چلنے میں (جو لوگوں کیلئے اس قدر مفید ہیں) اور بارش کے برسنے میں جو آسمان سے نیچے گرتا ہے جو خزاں کے بعد زمین کو از سر نو زندگی بخشتا ہے اور انواع اقسام کے درندوں کی تخلیق میں جو زمین پر بسیرا

کرتے ہیں۔ ہوا کی تبدیلی میں اور بادلوں میں
جو زمین کی خدمت بجا لانے کے لئے آسمان
و زمین کے درمیان معلق ہیں تفکر
کرنے والوں کے لئے خدا کی بہت سے نشانیاں
موجود ہیں۔

پس نظام کائنات کا مطالعہ شرط مسلمانی ہے کائنات اور انسان سب چیزوں میں خودی یعنی قانون (LAW) موجود ہے اور ان تمام خودیوں میں قریبی رشتہ ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے جس نے اپنی خودی کو پہچان لیا در اصل خدا کو پہچان لیا۔ یہی کائنات کی خودی (LAW) خدا کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہے جو کائنات کے ہر ذرے میں جاری و ساری ہے۔ لیکن کائنات کا فعل تخلیق ابھی ختم نہیں ہوا۔ اور یہ ترقی کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کل کائنات منازلِ ارتقاء کے طے کرنے میں مصروف ہے۔ جیسا کہ انسان متعدد منازل جمادات نباتات حیوانات کو طے کرنے کے بعد انسانیت کے درجے پہ پہنچا ہے اس اصولِ ارتقاء کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات اور انسان زمانۂ مستقبل میں مادیت کی زنجیروں سے آزاد ہوکر سراپا روحانیت بن جائیں گے۔ لیکن اس

اس منزل ارتقاء میں ہمواری نہیں۔ دن کے ہمراہ رات۔ بہار کے ہمراہ خزاں اور خدا کے ساتھ شیطان لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن انجام کار نیکی کی فتح ہوگی۔ در اصل برائی کا وجود انسان کو تکلیف پہنچانے کے لئے نہیں بلکہ نیکی کی خوبی اور خوش گوار نتیجے کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے ہے۔

اس دنیائے پُر شور و غوغا کے اسرار جس کی ہر نئی تخلیق پچھلی تخلیق کی مادیت میں کمی پیدا کر دیتی ہے۔ فہم انسانی سے بالاتر ہیں۔ اس کی معرفت صرف قوت عشق سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا ایک حقیقت ہے۔ جس کی ہر شئے اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کرنے کے لئے جد وجہد میں مصروف ہے۔ اس میں تغیر و تبدل کا عمل ہو رہا ہے اور اس حرکت مسلسل کا نام زندگی ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جہاں سر اقبالؒ برگساں کے عقیدہٴ کائنات کے پیرو نظر آتے ہیں۔

مادی اور روحانی دنیا علٰحدہ نہیں بلکہ مادیت روحانیت کی معرفت کا ابتدائی درجہ ہے۔ بناء بریں چاہیئے کہ مادیت سے کنارہ کش ہونے کے بجائے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں جس سے ذہنیت روشن ہوتی ہے۔ نیز تسخیر کائنات کے لئے روحانیت سے مدد لی جاسکتی ہے۔ لہذا علم آفاق و انفس ایک دوسرے کے ساتھ

سابقہ ہونے چاہئیں ۔ اگرچہ ابتداء میں مادہ کی طاقت ذہنیت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ لیکن بتدریج ذہنیت مادی طاقت پر غالب ہوجاتی ہے۔ اور دنیا روح کی ترقی میں ممد و معاون ہوجاتی ہے ۔ اس لئے اقبال دنیا کو مسجد قرار دیتے ہیں ۔

بال جبرئیلؒ میں سر اقبالؒ نے من کی دنیا اور تن کی دنیا کا مقابلہ شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق ہے اور تن کی دنیا سود و سودا و مکر و فن ۔ من کی دنیا پائیدار اور تن کی دنیا سائے کی طرح آنی جانی ہے۔ انسان اسرارِ کائنات کے وا کرنے اور کائنات کو خوب صورت بنانے میں مصروف ہے ۔ انسان فطرتاً جدت پسند اور بے چین واقع ہوا ہے ۔ اور تجسس اور جستجو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہیں ۔ اس لئے "میلاد آدم" کے وقت پر ایک طرف تو عشق نے نعرہ لگایا کہ خونیں جگر پیدا ہوا اور دوسری طرف حسن لرزنے لگا ۔ کہ صاحب نظر پیدا ہوا ۔

فطرت آشفت از خاک جہان مجبور<br>
خود گری ۔ خود شکنی خودنگری پیدا شد<br>
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل<br>
حذر اے پردگیاں پردہ دری پیدا شد

غرض انسان تسخیر کائنات کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو معرفت خودی کا ابتدائی قدم ہے۔ انسان کی خودی کا فلسفہ اسرار خودی میں بطور کلی واضح کیا گیا ہے اور ملت کی خودی کی توضیح اقبالؒ رموز بے خودی میں کرتے ہیں۔ اور کیا ئنات کی خودی کا حال گلشن راز جدید میں مندرج ہے۔

# کائنات میں انسان کا درجہ

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

قرآنِ پاک میں منقول ہے "جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے اور جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ" تمہارے تابع فرمان رکھا گیا ہے"۔ سر اقبالؒ فرماتے ہیں:-

تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

---

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است (جاوید نامہ)

موجودات کی تسخیر سے انسان نائب حق بنجاتا ہے اور اس خلافت الہٰی کا نمونہ کمال مصطفےٰ صلعم ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ،
غالب و کار آفریں ، کار کشا ۔ کار ساز

انسان احسن التقویم ہے اور امانتِ الٰہی کا حامل جس نے اس امانت الٰہی کو قبول کرکے اپنے جہول و ظلوم ہونے کا ثبوت دیا جس کو زمین اور آسمانوں ۔ دریاؤں اور پہاڑوں نے قبول کرنے سے حذر کیا ۔ بنا بر ایں انسان کو کائنات میں خاص جگہ دی گئی ہے ۔ اپنی تقدیر کو خود تشکیل کرسکتا ہے اور یہ وہ آگ کا شعلہ ہے جو عرش بریں سے لیکر پست ترین طبقہ زمین پر اپنا اثر پھیلا سکتا ہے ۔ مادیت کی زنجیروں کو توڑ دینا اس کے لئے آسان امر ہے ۔ یہ خدا کی ذات کا پرتو ہے جس کی ہستی میں خدا کا جمال نظر آ رہا ہے ۔ انسان میں اپنی ہستی کو ممتاز کر دینے کی خواہش اس کی فطرت کا تقاضا ہے ۔ ہر حالت میں وہ انفرادیت کو قایم رکھے گا ۔ چوں کہ یکتائی خدا کی صفات میں ہے اور انسان اس اعلیٰ ترین فرد واحد کے صفات کو خود میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ انسان قطرے کے مانند ہے جس میں بحر ذخار کی خوبیں پوشیدہ ہوں ۔ قطرہ اور سمندر کا فرق باعتبار خاصیت نہیں بلکہ مقداری ہے ۔

لہذا انسان وصال الٰہی سے اپنی شخصیت کو کھوتا

نہیں۔ جیسا کہ انسان وصالِ خدا کا طالب ہے خدا بھی انسان کے لئے بے تاب ہے۔ انسان کی اصل ایک پاک و صاف منبع سے ہے جس سے پیوستہ ہونے کا شوق ہمیشہ اس کے دامنگیر ہوتا ہے۔ ولولہ و شوق اور بلند ترین مقام پر پہنچنے کا اضطراب انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ غلامی انسانیت کے منافی ہے۔ عنایتِ ایزدی نے اس خاک کے پتلے کو علم الاشیاء اور علم الفطرت سے آشنا کر کے نوریوں سے سجدہ کرایا۔ اور کل کائنات کا نگراں بنا کر بھیجا۔ انسان کو فطرت کی شگفتگی کا رشک ہوتا ہے اور یہ اسکے مقابلہ میں اپنی سیہ بختی کا شکوہ کرتا ہے۔ تو زمین سے ندا آتی ہے۔

"اے انسان گلزارِ موجودات کے لئے تیری
ہستی باغباں کے مانند ہے۔ دنیا کا وجود
تجھ سے وابستہ ہے"

"انجمن حسن کی ہے تو۔ تیری تصویر ہوں میں
عشق کا تو ہے صحیفہ تیری تفسیر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے
بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے
نورِ خورشید کی محتاج ہے ہستی میری
اور بے منتِ خورشید چمک ہے تیری

آہ اے راز عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں الجھنے والے
ہائے غفلت کہ تیری آنکھ ہے پابند مجاز
ناز زیبا تھا تجھے تو ہے مگر گرمِ نیاز
تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

بار امانت خودی جو زمینوں نے قبول نہ کیا اس کا حامل انسان ہوا۔ اور اس وجہ سے اشرف المخلوقات کہلایا۔ لیکن انسان اپنی قدر قیمت سے آگاہ نہ ہوکر پابند نیاز ہو رہا ہے۔ انسان کی خودی وہ خزانہ ہے جس کو مشتِ خاکِ صحرا نے ڈھانک رکھا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ
میں اس میخانہ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں

نیچے کو شمع سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔
"شمع تو صرف شعلہ ہے۔ لیکن تو سراپا نور پنہائی ہے انسان خدا کی بنائی ہوئی دنیا کو خوبصورت بنا کر اس کا ہم کار ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ خدا اور بندہ کا امتیاز اٹھ جاتا ہے۔

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

---

بچشم من بہائے تو بلند است
کہ آوردی بہ بازار وجودم (پیام مشرق)
انسان سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں :-

ضمیر کن فکاں غیر از تو کس نیست
نشان بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بے باک تر نہ در رہ زیست
بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

زبور عجم میں فرماتے ہیں :-

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری و یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی و زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

---

ہر چند زمیں سائیم بر تو ز ثریائیم
دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر ما را

---

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

مقدر است کہ مسجود مہر و مہ باشی
ولے ہنوز نہ دانی چہا توانی کرد

---

**عقل و عشق** کائنات میں انسان جیسی برگزیدہ ہستی کیوں پیدا کی گئی ہے۔ سر اقبال حیات انسانی کا مقصد معرفت خودی قرار دیتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے آیا معرفت خودی عقل کے ذریعے ممکن ہے۔ اقبالؒ اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے قوتِ عشق کی توضیح کرتے ہیں جس کی بدولت انسان اپنی زندگی کے نصب العین کو حاصل کر سکتا ہے۔ عقل کے ذریعے آفاق پر غلبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن انفس کے علم کے لئے وجدان کا ہونا امر لازمی ہے۔

عقل و عشق کی کش مکش اور رقابت قدیم سے چلی آتی ہے جو مذاہب عقل کی لامتناہی قوت کے قائل ہیں مذاہب استدلالی کہتے ہیں اور جو مذاہب عشق یا دل یا وجدان کی عقل پر برتری کے قائل ہیں بنام مذاہب وجدانی موسوم ہیں۔ مذہب اسلام نے عقل اور عشق میں مصالحت کر کے ایک طرفہ تاکید کے خلاف آفاق و انفس کا پہلو بہ پہلو ذکر کیا ہے اور مطالعہ آفاق کے لئے علوم عقلی کو اور انفس

پر غور کرنے کے لئے قلب یا علوم وجدانی کو ضروری قرار دیا ہے) صوفیائے کرام میں بھی متقدمین نے اس بیان کی خوبی کو پہچانا اور اس پر کار بند رہے لیکن متصوفین جدیدہ نے جن کو ایک تاریک اور پست و پر یاس ماحول میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ عشق کی ایک طرفہ تاکید کرکے علوم عقلی کو جو مادیت کی ترقی سے متعلق ہیں۔ بالکل بے کار سمجھا اور ان کے مبالغہ آمیز نظریہ تفکر و تصور نے ان کو محض آلۂ بے حرکت بنادیا سر اقبال کی دقیق بیں نظروں نے اپنے ماحول کی خرابیوں کا معائنہ کرکے متقدمین اسلام کے عقائد کو دوبارہ اپنی ملت کے سامنے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا اور عقل و دل کے سطحی تضاد کو دور کرکے دونوں کو ایک رشتہ میں منسلک کردیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اصلیت یا حقائق کو جاننے کے دو ذرائع ہیں۔ مشاہدہ اور تصور۔ آپ تو مشاہدہ کے جو بوجہ عقل ہو مخالف نہیں لیکن عقل کی مبالغہ آمیز اہمیت کے مخالف ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ عالم مادی میں عقل کی رسائی ہو سکتی ہے۔ لیکن عالم بالا کے سمجھنے کے لئے وجدان و قلب ضروری ہے۔ عقل تسخیر کائنات کا ذریعہ ہے۔ جس سے انسان اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ مغرب نے مشاہدہ و عقل

کی اور مشرق نے تصور محض کی تاکید کی ہے۔ دراصل دونوں غلطی پر ہیں۔ تصور محض اخلاق انسانی کو آراستہ کردیتا ہے لیکن اس میں دوامیت نہیں پائی جاتی۔ اس طرح مادی طاقت و قدرت تصور و تفکر کے بغیر انسان کو بے رحم و ظالم بنادیتی ہیں۔ چاہیئے کہ عقل و عشق کو ملادیں۔ اور عقل کو دل کی رہبری میں دے کر سائنس کی حیرت انگیز قواء کو انسانی فلاح و بہبودی کے لئے استعمال کریں۔

سلوک کے ابتدائی مدارج میں عقل کی رہبری ضروری ہے۔ اس سے کائنات کا سطحی علم حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کی تہ تک پہنچنے کے لیئے کوئی دوسری قوت ضروری ہے جو وجدان یا عشق کہلاتی ہے۔ جسم پر روح کو مادیات پہ روحانیت کو برتری ہے۔ اس طرح عقل پر دل کو فوقیت ہے۔

"یک ذرہ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ"

(دل و عشق اقبالؒ کا مستقل مضمون ہے اور ان دونوں قواء کا آپ نے متعدد مرتبہ مقابلہ و موازنہ کیا ہے۔ بانگ درا کی ابتدائی نظموں سے ایک میں عقل و دل کا مناظرہ ہوتا ہے۔ عقل امور دنیوی کی رہبری پہ فخر کرتی ہے اور اپنے مظہر کائنات ہونے پر ناز کرتی ہے۔ جس کے جواب دل کہتا ہے۔)

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو۔ خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

عقل کو دل کا پاسباں ہوکر رہنا چاہیئے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

---

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عقل کی جولانگاہ اور ہے اور عشق کی اور۔ رازی کی حکمت قرآن کی روح سے نا آشنا ہے۔

خود آتش فروزد۔ دل بسوزد
ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

پیام مشرق میں عقل و عشق کے درمیان مناظرہ ہوتا ہے عقل کو دعویٰ ہے کہ علم آفاق اس کے قبضے میں ہے عشق جواب دیتا ہے :۔

چو با من یار بودی نور بودی
بریدی از من و نور تو نار است

حکمت و شعر کا فرق دیکھئے:-

بو علیؔ اندر غبار ناقہ گم
دستِ رومیؔ پردۂ محمل گرفت

زبورِ عجم کی پندرھویں نظم میں آپ فرماتے ہیں:- عقل و عشق دونوں ایک منزل کا ارادہ رکھتے ہیں اور دونوں امیر کارواں ہیں۔ عقل کو رہبری میں پس و پیش ہے۔ لیکن عشق کشاں کشاں لیجاتا ہے۔ اور انسان کو کہکشاں تک پہنچا دیتا ہے۔ عشق میں لذتِ والمی موجود ہے اور یہ ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ نیز فرماتے ہیں۔ عقل کو ہر قدم پہ لغزش ہے۔ (یعنی عشق مسلمان اور عقل زناری ہے)

کلیم سے معرفت کا سبق سیکھو نہ کہ دانائے فرنگ سے جو قلب بحر کو چیرنے کے باوجود وادیٔ سینا تک پہنچ نہ سکے۔ جمالِ الٰہی کا مشاہدہ تو کجا۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

بال جبرئیل میں فرماتے ہیں:-

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

گو کہ رازی کے نکات عجیب و غریب ہیں لیکن ضعف یقین

کا کیا علاج ہو۔ عقل سے نظر حکیمانہ عطا ہوتی ہے۔ لیکن ذوقِ رندانہ کا راز عشق میں مضمر ہے۔ پھر عقل و عشق کے متعلق فرماتے ہیں۔

کہاں حضور کی لذت کہاں دلیل حجاب

ہمارے ہم عصر عقل کو مشعلِ راہ سمجھے ہوئے ہیں اور اہل جنوں کے صاحب ادراک ہونے کی حقیقت سے ناواقف۔

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرف حیدر
زوالِ عشق و مستی حرف رازی

علم کا مقصد پاکی۔ عقل اور فقر کا مقصد محنت قلب و نگاہ ہے۔

علم فقیہ و حکیم۔ فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ۔ فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر۔ علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب۔ علم میں مستی گناہ

---

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

---

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے

---

ضرب کلیم میں آپ فرماتے ہیں علم تخمین و ظن اور عشق یقین ہے۔ نیز اول الذکر سراپا حجاب اور سوال ہے اور عشق سراپا حضور اور جواب ہے۔ عشق کے لوازمات گرمئ کائنات۔ تماشائے ذات۔ سکون و ثبات و حیات ہیں۔ سلطنت اور فقر و دین عشق کے معجزے ہیں۔ اور یہی مکان و مکیں۔ زمان و زمیں ہے۔ محبت میں آرام۔ منزل اور نتیجے کا خیال حرام ہے اور تڑپ جائز ہے۔ کلیم کے تجلیات اور حکیم کے مشاہدات کی آمیزش کے بغیر علم بے بصر ہوتا ہے۔

عشق زماں و مکاں سے آزاد ہوکر معشوق حقیقی کا پرستار ہوتا ہے۔ لیکن عقل طلسم وقت کو توڑ نہیں سکتی اور معشوق مجازی پہ نثار ہوتی رہتی ہے۔ عقل دنیا کے کارزار عمل میں پڑنے کے بجائے اس کا دور سے تماشا دیکھتی ہے اور دل بے خوف ہوکر آفات و بلیات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات
صدق خلیلؑ بھی ہے عشق۔ صبر حسینؑ بھی ہے عشق
معرکہ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

---

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی
جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

---

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

---

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جبتک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

---

بال جبرئیلؑ میں عشق کے متعلق فرماتے ہیں :-

کبھی تنہائی کوہ و دامن عشق
کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر

آپ دعا کرتے ہیں :-

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریک زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عشق اور فقر کے بیان میں فرماتے ہیں کہ عشق کی وجہ سے فقیر وارث پرویز بن جاتا ہے۔ جاوید نامے میں سعید حلیم پاشا مشرق و مغرب کا اختلاف بیان کرکے عشق اور عقل کے متعلق کہتے ہیں۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہم بر شود
نقش بند عالم دیگر شود

---

جاوید نامے کے صفحہ ۱۷ اور ۱۸ میں عقل اور عشق کی قوتوں کا بوضاحت تمام ذکر کیا گیا ہے۔ بانگ درا میں منقول ہے۔

تلخابۂ اجل میں جو عاشق کو مل گیا
پایا نہ خضرؑ نے مئے عمر دراز میں

اسرار خودی :-

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست

---

در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آبِ حیواں تیغ جوہر دار عشق

---

از نگاہ عشق خارا شق شود
عشقِ حق آخر سراپا حق شود

---

زبور عجم میں عشق کی کار فرمائیاں کا ذکر رنگین و دلکش الفاظ میں کرتے ہیں۔ لیز سر اقبالؒ عقل جہاں بیں اور عقل خود بیں کا فرق واضح کر کے فرماتے ہیں۔ در اصل عقل و عشق ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ دونوں میں فرق مراتب ہے۔ عقل جب سوز و ساز اور محبت اور خود بینی و ذوق کے ہمراہ ہو تو عشق کہلاتی ہے۔

پس عشق اصلاح نفس اور اخلاق ستودہ کا ذریعہ ہے جس کا اکمل ترین نمونہ پیغمبر صلعم ہیں۔ یورپ نے قوت عشق کو پس پشت ڈال دیا اور موردِ عتاب خداوندی ہوا۔ اس سرزمین کی

تقلید انسانی تباہی کا باعث ہے۔ آپ کے لئے شیطان مجسمۂ عقل اور وجدان قلب سے عاری شخصیت ہے اور مغرب جو عقل محض کا پرستار ہے "فسوں گری خرد کے سوا اور کچھ نہیں۔

نظام کائنات میں عشق کار فرما ہے اور ہر ذرے میں زندگی کا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ پس ہر اقبالؒ کے نئے نصب العین کا تعین اور ذوق یقین اور اس کے حصول میں جد و جہد عشق کہلاتا ہے۔ عشق ایمان کو استوار کرتا۔ افراد اور ملت کو زندگی جاوید بخشتا ہے اور ان کی خودی کو معراج کمال پر پہنچاتا ہے۔

آزادی خودداری۔ عمل پیہم اور بہادری اور مردانگی عشق کے ضروری صفات ہیں۔ کورانہ تقلید رہبانیت۔ قناعت۔ پستی اور غلامی عشق کے سد راہ ہیں۔ عشق کی تخلیق کے لئے آرزو کا پیدا ہونا اور مقاصد کا معین ہونا ضروری ہے۔ آرزو سے عشق کی رونق بلندی اور روشناسی ہوتی ہے۔ لیکن آرزو سے پہلے استعداد ضروری ہے

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پہ کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

ہیں سر اقبالؒ کے لئے مرد مومن کو عقل و عشق سے مزین ہونا چاہئے۔

# مردِ مومن

عبدالکریم الجیلی کی طرح سر اقبالؒ مرد کامل کے صفات کی تشریح کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ مرد مومن توحید کا علمبردار اور عاشق نہیں ہوتا ہے۔ اور شریعت اس کی مستحکم حصار ہے۔

تو اگر خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اور یہ عقل و عشق سے مزین ہوتا ہے۔ جواب شکوہ میں کہتے ہیں :-

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری

---

ماسوی اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

---

طینت پاک مسلماں گوہر است

آب و تابش از یم پیغمبر است
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک رہتا ہے اور ہر فرماں روا کے آگے بے باک ہوتا ہے۔ انسان کو سوائے خدائے واحد کے کسی دوسری طاقت کے آگے سرنگوں نہ ہونا چاہیئے۔ رجحان غلامی جو ہندستان میں پیدا ہو چلا ہے اس کی جڑ شرک میں مضمر ہے عقیدۂ توحید کا مقصد آزادی و دلیری ہے۔ اگر کوئی ہر فرماں روا کو مولائے برحق تسلیم کرتا جائے تو شرک کی کوئی حد بھی نہ ہوگی اور جذبات غلامانہ انسان کی طبیعت ثانی بن جائیں گے۔

ہر کہ حرف لا الٰہ از بر کند
عالمے را گم بخویش اندر کند

بال جبرئیل میں لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم سمجھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں لا الٰہ سے کائنات فتح ہو سکتی ہے لا سے حرکت اور الا سے سکون مراد ہے۔ لا الٰہ کے رمز کے سمجھنے کے بغیر ماسوی اللہ کا خوف رفع نہیں ہو سکتا۔ لا مرد حق کی پہلی منزل ہے۔ جس کی ضرب سے بود نابود ہو جاتا ہے۔

زمانۂ گذشتہ میں اس لا کی وجہ سے لات و منات پر ضرب کاری لگی اور قیصر و کسریٰ ہلاک ہوئے۔ اور اسی کی بدولت بانگ حق چارسوئے عالم

میں بلند ہوئی۔ اور غیر اللہ کا خوف دل سے رفع ہوا۔ زمانۂ حاضرہ میں روس میں لا سلاطین لا کلیسا اور لا اللہ کی بدولت انقلاب واقع ہوا۔ لیکن چاہیئے کہ لا سے الا کی طرف رجوع کریں کیونکہ یہ دونوں ساز و برگ مل رہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا باعث تباہی ہے۔ جادہ محبت میں خلیل اللہ نے لا سے الا کی طرف بڑھ کر محبت میں پختگی حاصل کی۔ مرد درویش اپنے کام کو لا الٰہ پر محمول کرتا ہے)

(پس مرد حُر خوف سے بے نیاز اور لا اللہ سے روشن ضمیر ہوتا ہے۔ سلطان اور میر کا بندہ نہیں ہوتا۔ استقلال و سوز و ساز کا زندہ نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی موت زندگی نو کا باعث ہوتی ہے۔ سلطان اس کو خراج دیتا ہے۔ اس کی شراب مے خواروں کی طبیعت میں گرمی و جوش پیدا کرتی ہے اسرار دین ہم سن کر یقیں کرتے ہیں وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔) ہم کلیسا (عیسوی تمدن) کے لیئے مسجد (اسلامی تمدن) بیچتے ہیں۔ اور وہ پیغمبر کے ہاتھ سے شراب طہور پیتا ہے۔ ہمارا پیمانہ خالی اور وہ مست الست ہوتا ہے۔ ہمارا قبلہ کبھی دیر کبھی کلیسا ہوتا ہے۔ لیکن وہ دوسرے سے طالب رزق نہیں ہوتا ہم خیال ہی خیال میں زندگی گذار دیتے ہیں۔ لیکن

اس کو زندگیٔ جاوید عطا ہوتی ہے۔ ہمارا عمل تخمین اور ظن سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن وہ سراپا کردار ہوتا ہے اور لا الہ کی تیغ اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس کی صحبت علم کتابی سے بہتر ہے۔

ضرب کلیم میں مرد قلندر کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ افکار جلی اور خفی سے آگاہ ہوتا ہے۔ اگر افکار کی تصدیق دل سے ہو تو یہ تابندہ گوہر سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ بندہ حر یا مومن وہ ہے جس کی ضرب کاری ہو اس کی نظر قلندری قبا پوشی اور کلہ داری سے مرکب ہوتی ہے۔ کافر اور مومن میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر آفاق میں گم ہوتا ہے۔ اور آخر الذکر میں آفاق گم ہوتا ہے۔ جدت گفتار و جدت کردار سے مزین ہوتا ہے۔ اور اس کی نگاہ عالم کو متزلزل کر دیتی ہے۔ یہ دوستوں میں نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے۔ باوجود خاکی ہونے کے افلاک سے دست و گریباں اور جبرئیلؑ اور اسرافیلؑ کا صیاد ہے۔ اور اپنی تقدیر کو خود ہی تشکیل کرتا ہے

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

مرد مومن کی گفتار و کردار میں اللہ کے برہان پائے جاتے ہیں وہ قہاری، غفاری، قدوسی

اور جبروتی فضائل سے خدا کے مانند مزین ہوتا ہے اور جبرئیلؑ امین کا ہمسایہ ہے۔ وہ صرف قرآن کا پڑھنے والا نہیں بلکہ خود سراپا قرآن بنجاتا ہے۔ اس کا مقام عرش بریں ہے۔ صداقت۔ عدالت اور شجاعت سے دنیا میں امامت کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ خود ہی تقدیر اور تقدیر گر ہوتا ہے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس کی ذات ابدی اور قید زماں و مکاں سے بالاتر ہے۔ دونوں عالم کا فاتح ہے۔ ورڈ زورتھ کی طرح اقبالؒ کہتے ہیں۔

می شود ہر سنگ رہ اورا ادیب
می شود برق و سحاب اورا خطیب

مرد مومن کا قلب مسکن خدا ہوتا ہے اور اس کے اعمال نماز و روزہ محض بیرونی نہیں ہوتے بلکہ تزکیۂ قلب اور اجتماع قومی اور اتحاد ملی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ خواہشات نفسانی ارادہ الٰہی میں فنا ہوجاتے ہیں۔ حسب و نسب اس کے لئے وجہ فخر نہیں ہوتے فقر حیدری۔ سیاست فاروقی۔ بصیرت رومی اور شاہین کی تیز نظری کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وحشت حجاز کی نیکیاں اس کے لئے مایۂ فخر ہوتی ہیں۔ وہ عربوں کی مردانگی

شجاعت و جانبازی کا نمونہ ہوتا ہے۔ اس کا جہاد کشور کشائی کے لئے نہیں بلکہ تبلیغ حق و صداقت کے لیے ہوتا ہے۔ (بلکہ حق و صداقت کے لیے ہوتا ہے) ظالم کے ظلم کا شکار نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی حفاظت آپ کرلیتا ہے۔ نفسِ امارہ کو اپنا غلام بناتا ہے۔ وہ مجتہد ہوتا ہے اور کل دنیا پر حکومت کرتا ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

---

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں۔ کار کشا و کار ساز

---

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

---

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر
امر و نہی او عیار خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم
ہم بقہر اندر مزاج او کریم

---

جاوید نامہ کی ایک نظم "حکومتِ الٰہی" میں فرماتے ہیں:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام
نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس
ملک و آئینش خدا داد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق
زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

(اس کے عمل پیہم میں جدت و اصلیت ہوتی ہے۔ اور بوجہ جدت دنیا کو خوب صورت بناتا ہے گو آفاق اس کے اندر گم ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خود اس کی دلربائیوں سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ وہ نفس کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ اور اپنی روحانی قوت کو ترقی دینے میں جد و جہد کرتا ہے۔ باہمت۔ خوش اعتماد۔ خود دار۔ بے تعصب۔ صاحب فقر۔ عاشق زار۔ بے خوف ہوتا ہے۔ برائی۔ جھوٹ۔ مکر۔ ریا۔ کمینہ پن سے بری رہتا ہے)

اپنی خودی کے مانند دوسروں کی خودی کا احترام کرتا ہے اور خدمتِ خلق میں غیر معمولی خوشی محسوس کرتا ہے۔ جوشِ عشق سے اس کو یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ دریا کو اپنے آغوش میں لے لے۔ راہِ عشق کے

کل مصائب کو بخوشی خاطر قبول کرلیتا ہے۔ اس کے فقر کے آگے شان سکندری بھی ہیچ ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللٰہی

ایسے فقیروں کی خدمت کرنا بھی باعثِ سعادت ہے۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

پھر اقبالؒ کے لئے فقر کے معنی اشیائے دنیوی سے علیحدگی نہیں بلکہ استغناء و بے نیازی ہے۔

سماں الفقر فخری کا رہا شان امارت میں
بانگ درا میں ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں۔

ہوا ہے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظ رنگیں نوانے راز یہ فاش

---

گرت ہواست کہ باخضر ہم نشیں باشی
نہاں زچشم سکندر چو آبِ حیواں باش

---

فقیر وہ ہے جو باوجود راہ نشیں ہونے کے اپنے دل کو غنی رکھے۔ اس کا دل خدا سے وابستہ

ہو اور سلاطین سے عقدہ کشائی کا طلبگار نہ ہو۔ کیونکہ آستانِ سلاطین کے بت کدے پہ جبیں سائی شایانِ شانِ مسلمانی نہیں ہے۔ فقر کامل ہوکر بادشاہی کی دلیل ہو جاتا ہے۔ اور فقر کے بورئے کے نیچے مسندِ کیقباد ہوتی ہے۔ اس فقر کی دستاویز شیروں کے دل کا خوف ہوتی ہے۔ اور اس مردِ خدا کے گریبان میں رستاخیز کے ہنگامے پوشیدہ ہوتے ہیں ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن اور فکر کی سرعت سے بجلی سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ خیال و نظر کی بدولت زندگی جاوید پاتا ہے اور اس کا دل اندیشہ ہائے گوناگوں سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کے ضمیر پاک۔ نگاہ بلند اور مستیٔ شوق کے آگے دولت قارون اور فکر افلاطون ہیچ ہیں۔ خودی کی حفاظت اس کا شعار ہوتا ہے۔

حکیمی نا مسلمانی خودی کی
کلیمی رمز پنہانی خودی کی
تجھے گر فقر شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

---

مرد درویش کا سرمایۂ آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

افسوس ہے مسلمانوں نے اسرار فقر کو نہ سمجھا۔ ورنہ فقیر کی ملکیت روم و شام کی بادشاہت ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

وہ خدا کے مانند جلیل اور جمیل ہوتا ہے اس کی اذانوں میں سر کلیم اور خلیل فاش ہوتا ہے اس کی زمین نا محدود اور اس کے افسانے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔

ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم اور اس کا ہاتھ دست خدا کے مانند غالب ہوتا ہے۔ اس کا دل دونوں جہاں سے بے نیاز اس کی امیدیں کم اور حوصلے زیادہ۔ مقاصد بلند، ادا دل فریب۔ نگاہ دلنواز نرم گفتار۔ گرم جستجو۔ عقل کی منزل اور عشق کا حاصل ہوتا ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فقر کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ ایک فقر کی بناء مکر اور فریب پر ہوتی ہے۔ جو قوموں کو مسکینی اور دلگیری کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسرا وہ فقر جس سے اسرار جہانگیری وا ہوں۔ اور مٹی میں اکسیر کی خاصیت پیدا کرے۔

شبیر کا سا فقر جس میں راز شہنشاہی مضمر ہو مسلمانوں کی میراث ہے۔ فقر کی معنی نگاہ راہ بیں اور زندہ دلی ہے۔ فقر خیبر شکن اور سلطان اور میر کو اپنا غلام بناتا ہے۔ ذوق و شوق و تسلیم و رضا جیسے صفات پیغمبری فقیر کا شعار ہیں۔ یہ گروہوں اور دنیا کی بادشاہوں پر غالب ہوتا ہے۔)

اس کے عقائد احکام قرآنِ پاک ہوتے ہیں۔ یہ بے پر دل کو ذوق پرواز بخشتا ہے۔ اس کے آگے سلاطین لرزتے ہیں۔ جذب و سلوک فقیر کی تقویت دلی کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ سلاطین کے آگے لا ملوک کا نعرہ لگاتا ہے۔ جب تک ایسا فقر کسی ملت میں باقی رہتا ہے۔ وہ تباہ نہیں ہوتی۔ اس کا استغنا اور شوق بے پروا اور افراد ملت کی آبرو کا ضامن ہوتا ہے۔ اور اس سے دین کو قوت پہنچتی ہے۔ فقر کے معنی تسخیر کائنات ہے۔ لیکن فاتح عالم ہوکر اس کے لذات سے بے اعتنائی کرنا مسلمان کا شیوہ ہے۔ فقرِ قرآنی تسخیر کائنات اور بندوں کا صفاتِ الٰہی سے متصف ہونا ہے۔

(اس کے برخلاف دوسرا فقرِ غار اور کوہ میں مقیم ہوکر ترک بدن کے ذریعے سے خدا کی تلاش کرنا ہے۔ نفس کو مارنا اور موت ان کے لئے احسن ہوتی ہے

لیکن فقر مسلمانی بوجہ سوز و ساز چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے۔ اس فقر عریاں کے آگے ماہ و مہر لرز جاتے ہیں۔ یہی فقر گرمیٔ بدر و حنین اور تکبیر حسین سے ظاہر ہوا تھا۔ لیکن آج صفحۂ ہستی سے ناپید ہے۔ مردِ خدا خود کو نورِ الہٰی میں ملاحظہ کرتا ہے۔ اور پیغمبر صلعم کو نمونۂ عمل بناتا ہے۔

غریبی میں ہوں محسود امیری
کہ غیرت مند ہے میری فقیری
حذر اس فقر درویشی سے جس نے
مسلماں کو سکھا دی سر بزیری

فقر راہبانہ سکون پرستی سے بیزار ہوتا ہے۔ کیوں کہ فقیر کا سفینہ ہمیشہ طوفانی ہوتا ہے۔ مومن کی غرض خودی کا عریاں مشاہدہ ہے۔

اہل فکر کا معجزہ فلسفہ پیچ در پیچ ..... اور اہل ذکر کا معجزہ ذکر موسیٰ۔ فرعون و طور ہے

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

پس مردِ آزاد کے مشاہدات گوناگوں ہیں اور فقر کا درجہ بادشاہت سے افضل ہے۔ بندۂ آزاد کا الہام فکر و عمل کی بالیدگی کا باعث ہوتا ہے

اس کے مقاصد اعلیٰ ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان کے نام آپ کا پیام ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

---

بہ پرواز آرد شاہینی بیاموز
تلاشِ دانہ در خاشاک تا کے

---

مدعا و مقصد کی وجہ سے زندگی کو بقا ہے پھر تحصیل مقصد کی آرزو ہونا چاہیے۔

آرزو را در دل زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست

آرزو سے دل زندہ رہتا ہے۔ فضاؤں کی تخلیق سے انسان باز رہ جائے تو اس کی طاقت پرواز فنا ہوجاتی ہے۔ آرزو خودی کو سرگرم اور مقاصد

کو صید کر سکتی ہے۔ زندگی سرمایہ آرزو ہے اور آرزو کے بطن سے عقل پیدا ہوتی ہے۔

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم
از شعاع آرزو تابندہ ایم
(پیام مشرق)

بر آید آرزو یا بر نیاید
شہید سوز و ساز آرزویم

---

دل من بے قرار آرزوئے
درون سینہ من ہائے و ہوئے

---

ز شاخ آرزو برخوردہ ام من
بہ راز زندگی پے بردہ ام من

---

آرزو کے بعد جستجو اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔

جستجو کل کی لئے پھرتی ہے اجزاء میں مجھے
حسن بے پایاں ہے درد لا دوا رکھتا ہوں میں

---

(اقبال کا کلام پیغام عمل ہے۔ برگساں کے مانند اقبال یقین کرتے ہیں کہ یہ دنیا متحرک ہے اور اس کی حرکت اس کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔ انسان

کو بھی چاہئے کہ جد و جہد اور عملِ پیہم کو اپنا نصب العین بنائے۔ چوں کہ حرکت عین فطرت ہے، اس کی خلاف ورزی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ بنا بر ایں آپ نے متصوفین حاضرہ کی مخالفت کی جو افراد کو سکون و جمود کی تعلیم دیتے ہیں۔ مردِ مومن میں رہبانیت اور توکل بے جا کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے سر گرم کار ہوتا ہے۔ عمل پیہم سے بے قراری و کوشش سے لذت یاب ہوتا رہتا ہے۔ بانگ درا میں فرماتے ہیں:

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
کوشش نا تمام کو بھی وہ احسن سمجھتے ہیں
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش نا تمام سے
انقلاب فطرت کا خاصہ ہے۔ دن رات کے لئے پیغام مرگ ہے اور خزاں بہار کے لئے غنچہ

وداع ہوکر پھول بن جاتا ہے۔ مہر کے طلوع ہونے سے ستارے پنہاں ہوجاتے ہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار
ذوقِ جدّت سے ہے ترکیب مزاجِ روزگار
ہے نگین دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوام نو

نہر کی مستانہ وار رفتار دیکھ کر فرماتے ہیں:۔

مستِ مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے کام کچھ جس کو نہیں قرار سے

طلوعِ صبح کا نظارہ آپ کو جستجو و عمل کی یاد دلاتا ہے

کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہوئے سرگرم ستیز
پھر سکھا تاریکیٔ باطل کو آدابِ گریز

پیام مشرق میں فرماتے ہیں:۔

تو اے جنگ از کنارہ عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

خطروں سے مقابلہ کرکے انسان اپنی خودی کو محکم کرتا ہے۔

ولیکن من نہ دانم کشتیٔ خویش
بدریائے کہ موجش بے نہنگ است

حصولِ مقصد کے لئے جب مستعد ہو تو منزل کا خیال بھی دل میں نہ لائیے۔

من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم
کہ منزل پیش من جز سنگ راہ نیست

---

مرا صاحب دلے این نکتہ آموخت
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوش تر

سفر پیہم۔ عشق پیہم اور تڑپ پیہم زندگی کا باعث ہیں

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است
چو ماہی جز تپش بر ما حرام است

نیز مردِ مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ بے خوف ہوتا ہے:۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

---

مسلمان کا قول ہے جفاکش کے لئے دنیا تنگ نہیں چیتے کا سا جگر اور شاہین کا سا تجسس ہونا چاہیئے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

صاحبِ ہمّت کا دل خوف و ہراس سے پاک رہتا ہے، اس کو نہ دولت سے محبّت ہوتی ہے اور نہ افلاس کا غم۔

ضربِ کلیم میں فرماتے ہیں کہ اسلام کا دوسرا نام ہی فقرِ غیور ہے۔

روح اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی
زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور

اس کتاب کی نظم "مستی کردار" میں فرماتے ہیں صوفی کا سلوک منزلِ "حال" میں پہنچ کر تمام ہو جاتا ہے اور ملا کی شریعت مستیٔ گفتار پر محمول ہے لیکن وہ مردِ مجاہد کہاں ہے جس کی رگ و پے میں مستیٔ کردار ہو قلندر وہ ہے جس کی حکومت مہر و ماہ و انجم پر رواں ہو وہ ایام کا مرکب نہیں بلکہ اس کا راکب ہوتا ہے ایسے مردِ کامل کی خدمت موجبِ سعادت ہے۔

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس انکی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینے میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

---

مردانِ خدا کا آستانہ دربارِ شاہی سے خوشتر ہے۔ پس دل کی پرورش کے لئے مردِ مومن کی نگاہ

غلط انداز کا طالب بننا چاہئے۔

آپ کا آخری شعر ہے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ مردِ کامل کا ظہور بقتضائے زمانہ ضرور ہوتا رہے گا۔

می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

خودی کو ابھار کر عمل خود داری و استغنے اور بے خوفی کی تعلیم دیکر روایاتِ قدیمہ اور اسلاف کے کارناموں کا ذکر کرکے اقبالؒ مردِ مومن اور عالمِ نو کو تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہے کہ ملّت اسلامیہ جیسی مساوات پسند قوم میں مرد کامل آسانی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آپ انسان کامل کو مردِ مومن کا مرادف سمجھتے ہیں۔

# باب پنجم

# تصوّفِ اقبال اور مفکّرین مغرب اور متصوّفین مشرق

سر اقبالؒ نے مشرقی اور مغربی خیالات کا گہرا مطالعہ کیا اور جن جن جواہر پاروں کو اپنی ذہن رسا اور وجدان قلب سے قابلِ عمل جانا ان کو ایک رشتے میں منسلک کرکے اپنے مخصوص فلسفیانہ تصوف کے رنگ میں اپنے ہم عصروں کے آگے پیش کیا علامہ اقبالؒ کے تصوف میں فلسفے کو اتنا دخل ہے کہ فلسفہ کے جاننے کے بغیر نکات تصوف کا سمجھنا امر محال ہے۔ در اصل آپ کا تصوف فلسفہ ہے۔ اور آپ کا فلسفہ تصوف۔ ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوسکتی۔ آپ کا تصوف وجدانی نہیں اور نہ خدا نے ایک اُمّی محض کے دل پر اسرار و حقایق سربستہ کو منکشف کیا تھا آپ کا ابتدائی زمانہ فلسفہ کے مطالعہ میں گذرا۔ لیکن

سے آپ کی روح کی تشنگی کو سیراب نہ کر سکا
انجام کار تصوف نے آپ کو اپنی آغوش میں لیکر تسکینِ قلبی عطا کی۔ رازہائے پنہاں آپ کے ضمیر پر ظاہر ہونے لگے۔ اور آپ نے دوسروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا۔ پیغمبرانہ شان اور مصلحانہ جلال آپ کی تصانیف سے ہویدا ہونے لگے۔

جاننا چاہئے کہ وجدان محض نے آپ کو اس درجہ پر فائز نہیں کیا جس پہ آ پہنچے۔ نیز صرف تعلیم جدید یا متصوفین کے عقائد نے آپ کے خیالات کو تشکیل نہیں کیا۔ بلکہ اقبالؒ کا تصوف مشرقی عقاید اور مغربی فلسفے کا جان بخش آمیزہ ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف میں متعدد فلسفہ دانوں صوفیوں کا ذکر کیا ہے۔ جاوید نامے میں نیٹشے سے ملاقات کرتے ہیں اور اس کی تعلیم سے بے انتہا متاثر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف مولانا رومؒ کو اپنا پیر و رہبر سمجھتے ہیں اور در اصل آپ کو مولانا کی ہمراہی میں فکری معراج نصیب ہوتی ہے۔ کئی نظموں میں حکمت رازی کا ذکر آتا ہے۔ اور افلاطونی حکمت کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں۔

مثنوی اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں خواجہ حافظ پہ بھی ایک جگہ نکتہ چینی کر بیٹھے ہیں۔ دوسرے

ایڈیشن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

اس ایڈیشن سے وہ اشعار خارج کر دیئے گئے ہیں جو خواجہ حافظ پر لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ ان سے محض ایک ادبی تنقید مقصود تھی۔ اور خواجہ حافظ کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ یہ طرزِ بیاں اکثر احباب کو ناگوار ہے۔ میں نے ان اشعار کو نکال کر ان کی جگہ نئے اشعار لکھدئیے ہیں۔

پیام مشرق اور جاوید نامے میں خصوصاً متعدد ماہرانِ فنون کا ذکر کرتے ہیں۔ تکریم قرآن اور احترام شریعت آپ کی نظروں میں مرد مومن کی اعلیٰ ترین صفات ہیں۔ یورپ جاکر آپ نے فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تصوف کی کتابیں بھی اس زمانے میں آپ کے زیر مطالعہ رہیں۔ پس فلسفہ کی تعلیم نے آپ کے عقاید مذہبی کو واضح تر اور روشن تر بنا دیا۔

## اقبالؒ اور افلاطون

افلاطون کا مذہب استدلالی اقبالؒ کے اس نظریہ کے خلاف ہے جس کی رو سے عشق کی حکومت تسلیم کی جاتی ہے۔ لہذا آپ افلاطونی حکمت کی تنقید کرتے ہوئے اسرار خودی میں فرماتے ہیں :-

گوسفندے در لباس آدم است
حکم او بر جانِ صوفی محکم است
عقل خود را بر سرِ گردوں رساند
عالمِ اسباب را افسانہ خواند
فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

افلاطون کے لئے فلسفہ کی تعلیم وہ اعلیٰ ترین تعلیم ہے جو صرف معدودے چند کا حصہ ہے۔ ریاضیات کو افلاطون کے فلسفے میں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن اقبالؒ علمِ عقلی کو خواہ ریاضیات ہوں یا منطق ہو سائنس۔ فلسفہ۔ وجدان اور عشق کا ابتدائی درجہ تصور کرتے ہیں۔

آپ کے لئے تحصیلِ علوم استدلالی نہیں بلکہ تحصیلِ علومِ لدنی ہے۔ جو معدودے چند سے مخصوص ہے۔ افلاطون قصص اور افسانوں کو اپنے مجوزہ نصابِ تعلیم سے نکال دینا چاہتا ہے۔ لیکن اقبال کی نظر میں اسلاف کے کارنامے متعلموں کے لئے مشعلِ ہدایت ہوتے ہیں۔ رسالۂ اردو کے اقبالؒ نمبر میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب فرماتے ہیں کہ اسرارِ خودی کی تصنیف کے موقع پر اقبال نیٹشے سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر

نکلسن کی فرمائش پر سر اقبالؒ اپنے فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو کچھ تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیانہ مذاہب کی تردید ہے۔ جو بجائے زندگی کے (فنا) موت کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ مذاہب ہیں جو انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ جن کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یعنی مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیئے۔ حالانکہ جوہر انسانیت یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ اور ان پر غالب آئے بلکہ انھیں اپنا خادم بنالے۔

افلاطون اپولو یعنی صفت۔ ترتیب۔ نظام و نسق و یکسانیت کا طرفدار ہے۔ اور اقبالؒ نیٹشے، ڈائیو نیسئیس (DIONYSIMS) یعنی ناچ۔ رنگ۔ جوش و خروش کے دلدادہ ہیں۔ اقبالؒ کی ہنگامہ آرا طبیعت کو سکون و جمود سے سخت نفرت ہے۔

## اقبال اور کانٹ (KANT)

کانٹ نے اپنے فلسفہ کی بناء عقاید سہ گانہ پر رکھی یعنی وجودِ خدا پہ ایمان لانا

انسان کا اپنے ارادے میں فاعل مختار ہونا۔ اور بقائے روح پہ یقین رکھنا۔

کانٹ عقل محض کو صرف علم موجودات تک محدود سمجھ کر ایمان وجود الٰہی کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ اس کے قول کے مطابق تاروں بھری آسمان اور قانون اخلاق کو جو فطرت انسانی میں مضمر ہے ملاحظہ کرنے کے بعد اس کو خدا کی ہستی پہ ایمان لانا پڑا۔ لیکن اقبالؒ کے عقائد کی تعمیر کے لئے قرآن مجید اور شعار پیغمبری کافی تھے۔

اقبالؒ کے فلسفے کی بناء مذہب پہ ہے۔ لیکن کانٹ کو اپنے فلسفے کے ثابت کرنے کے لئے مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اقبالؒ کا نصب العین خودی کی تقویت اور کانٹ کا مقصد حیات "ادائے فرائض بلا لحاظ نتیجہ" (DUTY FOR DUTY'S SAKE) ہے۔ یہاں کانٹ اور ہندوؤں کی مقدس کتاب بھگوت گیتا کے اصول اخلاق میں مماثلت نظر آتی ہے جس کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ انجام کو پیش نظر رکھنے کے بغیر نیکی کرتا جائے۔ گو اقبال بھی ان نیکیوں کو جو جنت کی لالچ میں انسان سے صادر ہوتی ہیں سوداگری تصور کرتے ہیں۔ لیکن ارتکاب افعال کے موقع پر اپنے نصب العین کا نظروں سے

اوجھل ہونا پسند نہیں کرتے۔ یہاں ہمیں رابعہ بصریؒ کے عبادات بے غرض کے متعلق اس قول کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں جس کا ذکر اس مقالے کی تمہید میں کیا جا چکا ہے۔

دوسرا فرق اقبالؒ اور کانٹ کے عقائد میں یہ ہے کہ کانٹ اپنے اصول فلسفہ کو متعین کرکے اس کے ثابت کرنے کے لئے بقاء پر ایمان لایا اور اقبالؒ نے بقاء کو مقصد حیات قرار دیکر جدو جہد و شوق اور عشق کی تعلیم دی۔

## اقبالؒ اور بٹلر

"بٹلر کے نظریہ" آوازِ ضمیر" اور اقبال کے فلسفہ خودی) میں مماثلت نظر آتی ہے۔ بٹلر کے لئے ضمیر کی آواز بھلائی اور برائی کا معیار ہے، جس کی عموماً یہ تنقید کیجاتی تھی کہ مجرم کا ضمیر کبھی اس کو اپنے فعل پر لعنت کرنے پر مائل نہیں کرتا۔ عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اس کے جواب میں بٹلر کہتا ہے کہ ایک تربیت یافتہ ضمیر سے ارتکاب غلطی امر محال ہے۔

سر اقبالؒ بھی ضمیر کی آواز کو اہم سمجھتے ہیں۔ اور ضمیر کی تربیت کے ذرائع اور طریقے بیان کرتے ہیں اور اس ضمیر تربیت یافتہ کی آواز کو وجدان یا خودی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں

بھی دل کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قلب مومن میں خدا متمکن ہوتا ہے۔ اور اس کا مرتبہ عرش بریں سے بڑھ کر ہے۔ افلاطونیت جدیدہ نے صدیوں پہلے سے ہی دل کو اعلیٰ ترین علم و معرفت کا ذریعہ جانا اور عیسائی مذہب میں بھی متقدمین نے وجدان قلبی کو اتنی اہمیت دی کہ ان میں سے ایک فرقہ قلب کی تعلیم و تربیت کے لیے دنیا سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرنے لگا۔ ہر مذہب میں اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں لوگوں نے اپنی زندگی تزکیہ قلب کے لیے وقف کر دی۔ مذاہب مختلف کی زندگی کے اس مرحلے پر تمہید میں ایک اجمالی نظر ڈالی جا چکی ہے۔ در حقیقت آواز ضمیر، وجدان، قلب، ذوق دل سب مذہبیت میں داخل ہیں۔

اقبالؒ کی تمام شاعری اور فلسفہ کی بنیاد خودی کا تصور ہے۔ اس کی تربیت انسانی زندگی کا نصب العین ہے جس کی بدولت وہ روحانی ترقی کے انتہائی مدارج طے کرتا ہے۔ اقبالؒ انسان کے لیے اپنے نصب العین کے حاصل کرنے کا قریب تر اور یقینی تر ذریعہ "قلب" قرار دیتے ہیں۔ بٹلر کے لیے "آواز ضمیر" اصول اخلاق کی رو سے اہم ہے لیکن اقبالؒ کے لیے آواز قلب سے معرفت خودی کا کام لیا جاتا ہے۔

## اقبال اور شوپن ہاور

شوپن ہاور علوم عقلی کی اشیائے ظاہری
تک محدود قرار دی لیکن عموماً ہندوؤں کے مانند اور
خاص طور پہ بدھ ۔ جین اور باقی مذاہب کے مانند
دنیا کے سراپا دردو الم اور مکر، فریب ہونے پہ اعتقاد
رکھتا ہے اس کی نظر میں دنیا سراب محض اور بازیچۂ
اطفال کے سوا کچھ نہیں۔

بنابریں اس نے اس قید حیات اور بند غم
سے نجات حاصل کرنے کو نصب العین انسانی قرار دیا
جو اقبال کے فلسفے کے برخلاف ہے۔ اس لئے یہ کہا
جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کی ہنگامہ آراء طبیعت شوپن ہاور
کے تاریک نظر فلسفے سے متاثر ہوئی۔

## اقبال اور برگساں

مذکورۂ بالا فلسفیوں کی بہ
نسبت اقبال کے فلسفے اور
میں مماثلت نظر آتی ہے.
لہذا ان دونوں کے عقاید کا ذکر وضاحت طلب ہے۔

برگساں کائنات کی بنیادی حقیقت "انقلاب"
تصور کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ زندگی کے دو لمحے
ایک دوسرے کے موافق نہیں ہوتے لیکن ان مسلسل
انقلابات کی سرعت رفتار کی وجہ عقل انسانی ان کے
مشاہدے سے قاصر ہے جیسا کہ سینما کے فلم میں
متعدد تصاویر کی حرکت اتنی سرعت سے ہوتی ہے

کہ پہلی تصویر کا اثر دماغ سے زائل ہونے سے پیشتر ہی دوسری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور علم نفسیات کی رو سے ان متعدد تصاویر میں تمیز کرنیکی صلاحیت دماغ انسانی میں بوجہ انکی سرعت رفتار کے باقی نہیں رہتی۔ اس طرح یہ سب اشیائے متعلقہ ایک سلسلہ میں نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح کائنات میں انقلابات اور تغیرات کا مشاہدہ عقل انسانی سے باہر ہے۔ اسی لئے ہم کو متعدد جدا جدا اشیاء ایک سلسلے کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔

ان حقائق کا سمجھنا صرف وجدان کے ذریعے ممکن ہوسکتا ہے۔ اقبالؒ بھی برگسان کی طرح انقلاب و تغیر و تبدیلی کے قائل ہیں۔ نیز برگسان تخلیق ارتقائی کا علمبردار ہے اور کہتا ہے کہ قوائے حیات کا مقتضائے فطرت یہ ہے کہ حرکت۔ تخلیق۔ اور اعمال دوامی کا صدور ہوتا ہے اشیائے نو کی طرف رغبت انفرادیت اور آزادی اور تخلیق قانون ارتقاء سے وابستہ ہیں۔ یہ ہمیشہ مادیت کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ اور مادیت قاطع حیات ہے۔ پس کل اشیائے ذی روح سکون اور موت کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ انسان بوجہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے آزادی۔ تخلیق۔ اصلاح ماحول اور اس سے سازگاری اور ماضی کو پیش نظر رکھ کر خوشگوار مستقبل

کے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مسلسل ترقی کرتا جاتا ہے۔ حقیقت بھی تخلیقی ہے اور قوتِ حیات بھی جو ظہور حقیقت اور اسکی آفرینش ہے، حقیقت کی حصہ دار ہونے کی وجہ سے متحرک، زور آور اور تخلیقی ہے۔ انسان روح کے زیر فرمان رہ کر صفت آزادی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ انسان کا واصل حقیقت ہونا شبنم کے سمندر میں داخل ہونے کے مانند ہے۔ انسان روح اور جسم کا مرکب ہے اور ان دونوں کا فرق نوع کا نہیں بلکہ درجے کا ہے۔ روح سے ارتقائی تخلیق کا صدور ہوتا رہتا ہے۔

لہذا زمانہ بقید مکان نہیں۔ اگر صرف مادّے کا وجود ہوتا تو اشیاء کو بقید مکان لایا جا سکتا تھا۔ اس طرح کائنات میں بھی روح کار فرما ہے لیکن تغیر و تبدیلی دیر پا ہونے کی وجہ سے اس کا سمجھنا عقل انسانی سے بالاتر نہیں۔ مثال کے لئے کائنات کی کسی شئے جیسے میز، کرسی، یا درخت ہی کو لیجئے۔ اگر یہ ہر لمحہ بدلتی رہیں تو ہم ہرگز نہیں پہچان سکیں گے۔ کہ یہ میز یا کرسی یا درخت ہے۔ اس لئے اشیائے کائنات کے سمجھنے میں ہمیں وہ دقت نہیں ہوتی جیسی کہ روحانیت کے سمجھنے میں۔ تاہم کائنات کی بعض چیزوں کی معرفت میں ان کی سرعتِ رفتار یا حرکت کے موقع پر کبھی

کبھی نظر انسانی کو دھوکہ ہو جاتا ہے۔ پس افعال روحانی
کی تبدیلی یا انقلاب کا سمجھنا ان کی سرعت حرکت کی
وجہ سے عقل انسانی کے ذریعہ ممکن نہیں اور اس
کی معرفت کے لئے وجدان کی ضرورت لاحق ہوتی
ہے۔ عقل کا فعل مادیت تک محدود ہے۔ روحانیات
کے جاننے والے اور اسرار حقائق کو سمجھنے کے لئے ہمیں
عقل سے بالاتر ہونا چاہیے۔

وجدان ایک چراغ کی طرح کبھی کبھی چمک اٹھتا
ہے۔ عقل ان وجدانی حالتوں کو ترتیب دیکر انہیں
گہرے بنا دیتی ہے۔ انسان کامل میں عقل و وجدان
دونوں نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ چوں کہ ضروریات
انسانی بیش تر ہیں۔ اس لئے عقل (INTELLECT)
پہلے کام کرتی ہے اور وجدان (INTUITION) آخر
میں۔ لیکن وجدان عقل سے بڑھ کر ہے۔ وہ فلسفہ
جس میں عقل و وجدان دونوں کی آمیزش
ہو بہت سے مشکلات کو رفع کرتا
ہے۔ عقل سکون اور یکسانیت پہ مائل ہے اور
قوت حیات۔ ارتقاء۔ ارتکاب افعال اور تخلیق پر
آمادہ ہے۔ قوت حیات کی بنائی ہوئی چیزوں کو
عقل دیکھنے اور سمجھنے کی خواہشمند ہے۔ نیکی ترقی
روح کی علامت ہے۔ صرف خدا حقیقت کامل ہے۔
انسان حقیقت اور غیر حقیقت سے مرکب ہے۔

دونوں کا فرق نوع کا نہیں بلکہ درجے کا ہے انسان اگر غیر حقیقت سے پاک ہوجائے تو خدائی بجالائیگا۔

اقبالؒ عقل کو بالکل بے کار نہیں سمجھتے۔ بلکہ عشق کے منازل کے طے کرنے میں عقل کو خادم کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا مقصد برگساں کے مانند صرف معرفت حق نہیں بلکہ وصال حقیقت بھی ہے۔ لیکن اقبالؒ کے لئے وصل کے معنی شبنم کا دریا میں ملنا نہیں بلکہ شرر کا پتھر میں پوشیدہ ہوکر قائم رہنا یا کرن کا آفتاب میں قیام یا بو کا پھول میں بسنا ہے۔

برگساں ارتقائی تخلیق کی قوت کو حقیقت یا خدا کا مرادف سمجھتا ہے۔ اور اقبالؒ کا خدا خالق خودی اور خود بھی خودی ہے۔ برگساں کے مانند اقبالؒ کے لئے بھی جذبۂ تخلیق خدا اور انسان کا مقتضائے فطرت ہے۔ برگساں کے فلسفے کی بنیاد جذبۂ تخلیق اور اقبالؒ کے فلسفے کی جان معرفت اور تقویت خودی ہے۔

## اقبال اور نطشے

یوروپین مفکرین کے خیالات میں سے جس کے فلسفے نے اقبال سے خراج تحسین وصول کیا وہ نطشے ہے۔ نطشے کا فلسفہ اقبالؒ کے قیام یورپ کے زمانے میں مقبول ہورہا تھا۔ اس نامور فلسفی نے انیسویں

صدی میں جرمنی کے مایوس کن ماحول سے متاثر ہو کر اپنے فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ بعینہ سر اقبال کا فلسفہ بھی اپنے ماحول اور سرزمین ہند کی پیداوار ہے۔ کہتے ہیں کہ نیٹشے نے ڈارون کے قانون ارتقاء کو ارادۂ اقتدار (THE WILL TO POWER) سے ملا کر خاص فلسفہ بنا دیا۔ ڈارون اور اسپنسر، فلسفۂ تنازع للبقاء یا پیکار حیات کے معتقد ہیں ڈارون کانٹ اور اسپنسر کے لیے زندگی وجود کی کشمکش کا نام ہے۔ اور نیٹشے کے لئے زندگی اقتدار کے بڑھانے کی کشمکش ہے۔ ڈارون اور اسپنسر نے کہا کہ طاقتور زندہ رہ سکتے ہیں اور زندگی در اصل بقا کی کوشش ہے۔ نیٹشے کا عقیدہ ہے صرف طاقتور کو زندہ رہنا چاہیے اور زندگی حصولِ قوت کی کوشش ہے۔ پہلے پہل نیٹشے کا فلسفہ شوپن ہاور کے زیر اثر رہا۔ یعنی "فلسفہ خواہش زیست" پہ دونوں متفق رہے۔ لیکن شوپن ہاور "خواہش زیست" کو زشت اور نیٹشے اس کو خوبی شمار کرتا ہے۔ نیٹشے ڈارون کے قانونِ ارتقائی کو قیاس بے دلیل ٹھہرا کر اس کا خلاصہ خواہش اقتدار کی صورت میں پیش کرتا ہے جو اس کے عقیدے میں بہترین نیکی اور افزونیٔ حیات کا باعث ہے۔

جس وقت نیٹشے نے اپنے فلسفے کو تشکیل دیا عیسائیوں کا ایک فرقہ عزلت نشین ہوکر زندگی کو باعثِ آلام اور گناہ جان کر اس سے نجات پانے کا خواہاں رہتا تھا۔ دوسری طرف یونانی تمدن اور صنائع کی طرف عوام راغب ہو رہے تھے براڈیس (BRODICE) کا عقیدہ ہے کہ نیٹشے رے نن (RENAN) کے خیالات سے متاثر ہوا جس نے طاقت وروں کی آفرینش کو حیاتِ انسانی کا مقصد قرار دے کر کمزوروں پر غلبہ حاصل کرنے کا اعلان کیا۔ نیز رے نن نے بھی عیسائیوں کے اصول اخلاق کے برخلاف علم بغاوت بلند کیا کیونکہ اس میں افادۂ شخصی کو اجتماعیت کے مقابلے میں کم تر سمجھا گیا تھا نیٹشے کا اصولِ اخلاق انفرادی ہے جس کی رو سے وہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی نجات کی کوشش کرنی چاہیے۔ نیٹشے کا فوق البشر جرات اور ہمت سے مزین لیکن رحم اور ہمدردی سے نا آشنا ہے۔ اقبال کے مانند نیٹشے بھی کہتا ہے کہ جد و جہد۔ تربیت نفسی اور تکالیف کا مقابلہ اخلاقِ انسانی کی پائداری کا باعث ہوتے ہیں۔ بے غرضی انسانیت۔ رہبانیت اور ایثار نیٹشے سے کوسوں دور ہیں۔ نیٹشے کا فوق البشر زمانہ قدیم کے یونانی تخیل کے سیزر یا نپولین کے مانند ہے اسکی آزادی پسند طبیعت کسی حاکم کے زیر فرمان زندگی

بسر کرنے کو برا تصور کرتی ہے۔ اس کے لئے عیسائیوں کے قوانین اخلاق غلامانہ ہیں جن کی تشکیل دراصل ان کے یہودیوں کی غلامی کی زمانے میں ہوئی تھیں۔ نیٹشے کے لئے سوسائٹی کے صرف دو فرقے ہو سکتے ہیں یعنی آقا اور غلام۔ جن کے اخلاق جدا گانہ ہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اخلاق آقا (MASTER'S MORALITY) کی پیروی کرکے فوق البشر بننے کی کوشش کریں۔ خواہ اس مقصد کی تکمیل میں کمزوروں کی بربادی ہی کیوں نہ ہو۔ خواہش اقتدار۔ جدوجہد اور تنازعات کا مقصد فوق البشر کی پیدائش ہے جو اپنی قوم کی نجات کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوگا۔ اور ان کل قواء کو جو انسانی زندگی کے خلاف ہیں نیست و نابود کردیگا۔ اور قیامت بن کر دنیا میں قیامت برپا کریگا۔ طاقت اور قوت میں یگانۂ روزگار۔ فاعل مختار اور قوت تخلیق میں بے نظیر ہوگا۔ انسانوں میں آزادیٔ فعل اور قول کے بیج بوئیگا۔ اور ان کو اسرار نہاں سے آگاہ کرکے انھیں ان کے مقام اور درجے سے باخبر کریگا اور انکو رسم و رواج کی زنجیروں سے آزاد کرکے عقل و حکمت پر انسانیت کی تعمیر کریگا۔ نیٹشے اپنے فوق البشر کی تشکیل میں منکر خدا بھی ہوجاتا ہے۔ یعنے کہتا ہے کہ انسان کو کسی طاقت کے خواہ خدائی طاقت ہی کیوں نہ ہو زیر فرمان

نہیں رہنا چاہیئے۔ سر اقبالؒ بھی غلامی کی مذمت کرتے ہیں۔ لیکن آپ کی خوش اعتقادی نے آپ کو بارہا اطاعتِ خداوندی کو داخلِ حسنات سمجھنے اور اس پر زور دینے پر آمادہ کیا۔ آپ نے ماسوی اللہ کی اطاعت کو زوال اخلاق کا باعث سمجھا۔ اسی بناء پر اقبالؒ "پیامِ مشرق" اور "جاوید نامہ" میں نٹیشے کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

قلب او مومن دماغش کافر است

نٹیشے خدا پرست یا دھری نہیں بلکہ آدم پرست ہے۔ اور اقبالؒ خدا اور مذہب کے پرستار ہیں۔

نیز نٹیشے کل مذاہب کو جو اثبات حیات پر مبنی ہیں اور دوسرے مذاہب کو جو زندگی کو ذریعہ آلام سمجھ کر نفی حیات کی ترغیب دیتے ہیں برا تصور کرتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی دردِ زندگی کو دفع کرنے کے لئے ایک دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ جس کی ضرورت انسان کو ابتدائی زمانہ میں محسوس ہوتی ہے ورنہ ہر وہ اصولِ زندگی جس سے یہ قوت پیدا ہو جو نیک ہے اور ہر وہ طریقہ جو انسان کو کمزور کرے بد ہے۔ گناہ در اصل بد نہیں۔ ہر شئے صورت بدل کر کبھی بھلائی اور کبھی برائی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

نیٹشے جسم کے بغیر بقائے روح کا معتقد نہیں لیکن سر اقبالؒ کا فلسفہ بقائے روح پر تعمیر ہوا ہے عدل نیکی ۔ رحم اور ہمدردی کو اقبالؒ داخل حسنات سمجھتے ہیں جن کا نیٹشے منکر ہے ۔ نیز نیٹشے کی نجات انفرادی کے مقابلے میں اقبالؒ نجات ملی کے راگ گاتے ہیں گو کہ اقبال کا انسان کامل بھی الماس کے مانند سخت ہے لیکن رحم و ہمدردی میں گویا دامن کوہ میں جوئے آب ہے۔ پیام مشرق میں کہتے ہیں۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دل دردآشنائے
چو جوئے در کنارِ کوہسارے

آپ کا مرد مومن پیغمبر صلعم کا نمونہ ہے جس کو سیاست ۔ اخلاق ۔ وجدان اور ایمان سے مزین ہونا چاہیئے اور جو دنیا کو مادیت کے پنجے سے چھڑا کر اس کو آزادی عطا کرتا ہے ، اور اقوام جنگ جو کو پیغام صلح سناتا ہے۔ اقبالؒ کا انسان کامل نیٹشے کی طرح طبقۂ امراء سے مخصوص نہیں ہے۔ اقبالؒ کا عقیدہ ہے کہ مرد مومن کا ظہور اقوام پسیتہ سے بھی ممکن ہے۔

نیٹشے اقبالؒ کی طرح ہر رکاوٹ کو دعوتِ عمل قرار

قرار دیتا ہے، اقبالؒ پیام مشرق میں نیٹشے کی زبانی شوپن ہاور سے کہتے ہیں۔

درمان ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

الغرض اقبالؒ اور نیٹشے دونوں کہتے ہیں کہ رکاوٹوں سے پست حوصلہ ہونے کے بجائے ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ نیز عقائد ارتقائے حیات۔ عظمت انسانی۔ تسخیر فطرت احترام زندگی اور دعوت عمل میں اقبال اور نیٹشے، میں حد درجہ مماثلت نظر آتی ہے۔ در اصل یہی اسلام کے عقاید اساسی ہیں اور یہی وجہ ہے جس کی بناء پر اقبالؒ نیٹشے کے قلب کو مومن قرار دیتے ہیں۔

آں کہ بر طرح حرم بُت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

جاوید نامہ میں آپ کی نیٹشے سے ملاقات ہوتی ہے جس کا درجہ ان کے نزدیک "مجذوب" کا ہے۔ ایک جگہ اس کو "حلاج بے دار و رسن" کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ نیٹشے نے فوق البشر کے نام سے داستان کہن کو نئے انداز سے دہرایا لیکن زمانے نے اس کی قدر نہ پہچانی۔ در اصل اس کے

جوش نے اس کی فہم کو زیر لقاب رکھا۔ اس نے لا تو کہدیا لیکن کسی رہبر کامل کی مدد نہ ہونے کی وجہ سے "الا" کی طرف قدم بڑھانے سے قاصر رہا۔ تجلی تو اس سے ہم آغوش رہی لیکن وہ اس کے وجود سے بے خبر رہا۔ اقبالؒ بال جبریل میں بھی اس کی واردات قلب اور بلا رہبر ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسرار خودی میں "ریزۂ الماس اور شبنم والی نظم میں کہتے ہیں کہ کمزوری انسان کے لئے قاطع حیات ہے۔ ہیرے اور کوئلے کی حقیقت کو ملاحظہ کیجیے۔ جس میں ایک اپنی سخت جانی کی بدولت آب و تاب پاتا ہے اور دوسرا نرم رہ کر روسیاہ ہوتا ہے۔ نیز نطشے کی طرح اقبالؒ رہبانیت پر ہمیشہ حملہ کرتے رہے اقبالؒ اور نطشے دونوں جستجوئے خدا سے ہٹ کر انسان کامل کی تلاش میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نطشے کے لئے حصول اقتدار ہی اشیائے ذی شعور اور غیر ذی شعور! برسر پیکار ہیں اور اقبالؒ کے فلسفۂ خودی میں بھی ذوقِ اقتدار ہی کائنات کی چیزوں کی جد و جہد کا باعث ہے۔ دونوں کے لئے دنیا میدانِ عمل ہے۔ نطشے کہتا ہے اگر عوام کی رائے پر کوئی کام کیا جائے تو انسان پست تر ہو جائے گا یہاں وہ افلاطون کا ہم خیال نظر آتا ہے جس میں

صرف چند افراد اعلیٰ نسب، کی حکومت تسلیم کی گئی ہے اقبالؒ بھی نیٹشے کے مانند جمہوریت کے خلاف ہیں لیکن مساوات اسلامی ہمیشہ اقبالؒ کے مدِ نظر رہی نیٹشے مساوات اور اشتراکیت کو دہوکہ بازی کا مرادف سمجھتا ہے۔ اقبالؒ سرمایہ داری کو بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ ان کے مرد مومن کا مقصد حیات، وصل حق اور نیٹشے کے فوق البشر کا مقصد زندگی حصول اقتدار اور قدرت ہے۔ اقبال خدا کو انسانی صورت پر ڈھال کر شکوہ اور شکایت کرنے لگتے ہیں۔ لیکن نیٹشے کی طرح خدا سے انکار نہیں کرتے نیٹشے عیسائیوں کے اصول اخلاق کے خلاف جہاد کرتا ہے اور اقبالؒ تصوف عامہ کے جمود اور تقدیر پرستوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ دونوں عمل کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ دونوں نے اپنے زمانے کے خلاف "خطروں میں زندگی ہے" کا نعرہ لگایا اقبالؒ کے زمانے میں ہندوستان قناعت اور توکل کی آماج گاہ اور نیٹشے کے زمانے میں جرمنی شوپن ہار کے فلسفہ کے بعد افسردگی اور پست ہمتی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اقبالؒ اور نیٹشے دونوں اپنے ماحول کے خلاف بر سرِ جنگ ہوئے اور نیٹشے نے اپنے خواہش اقتدار کے فلسفے پر یہاں تک زور دیا کہ اس نے

فوق البشر کیلئے حصول اقتدار کیلئے ظلم اور بیرحمی بھی روا رکھی اقبال نے بھی اس جوش و خروش کا اظہار کیا۔ اور گو کہ آپکے وہم و خیال نے بھی عالمِ بالا کی سیر کی۔ لیکن آپ نے اپنے جوش میں حد اعتدال سے گذرنے سے احتراز کیا۔ اور اقبال کے مردِ مومن میں بہادری اور رحم دلی۔ اقتدار اور خاکساری۔ فخر و ایثار ایک دوسرے کے لازم و ملزوم رہے۔

نیٹشے کا عقیدہ ہے کہ کائنات مسلسل مختلف دائروں میں حرکت کر رہی ہے۔ اور اشیائے عالم از سرِ نو پیدا ہو رہی ہیں۔ کیونکہ زمانہ نا محدود ہے اور اشیائے کائنات کی ساخت محدود ہے اس لئے اشیائے عالم کے ایک مرتبہ نمودار ہونے کے بعد انھیں اشیاء کا دوسرے دائرے میں آنا جو زمانۂ نا محدود میں پیدا ہو رہے ہیں امر لازمی ہے۔ نیٹشے کا عقیدہ ہے کہ انسان ایک دائرہ میں جب ترقی کے آخری درجے تک پہنچ جاتا ہے اور فوق البشر نمودار ہوجاتا ہے۔ تو دوسرا دائرہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس طرح سے کائنات متعدد دائروں میں حرکت کرتی رہتی ہے۔ لیکن اقبالؒ تکرار دائرات کے مخالف ہیں اور مولانا رومؒ کی طرح اصولِ ارتقاء کے معتقد جس کی رو سے انسانی ترقی دائروں کی بجائے ایک سیدھے خط میں ہوتی ہے۔ یعنی جمادات۔ نباتات اور حیوانات

کے درجے سے ترقی کرتے ہوئے فی الحال درجہ انسانیت میں ہے اور آئندہ اس طرح ترقی کرتا ہُوا، ملکی ملکوتی اور لاہوتی ہو جائیگا۔ پس اقبالؒ کے لئے انسان ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے اور اس کا ہر قدم پچھلے قدم سے بہتر ہوتا ہے۔ "فوق البشر" اس سے پہلے متعدد مرتبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اور آئندہ بھی پیدا ہوتا رہیگا۔ اس راہ میں اسلاف کے کارنامے اس کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں اور وہ عشق سے اپنی خودی کو تقویت پہنچاتا رہتا ہے اور تقلید سے محترز رہتا ہے، کیونکہ تقلید مقلد کو عزّت نفسی اور اعتمادِ نفسی سے دور کردیتی ہے۔ انسان کی خودی محدود ہے لیکن خدا کی لا محدود خودی میں مل کر فنا نہیں ہوتی بلکہ جیسا کہ چراغ اپنے وجود کو آفتاب کے مقابلے میں باوجود اس کی لا محدود روشنی کے قائم رکھ سکتا ہے اس طرح انسان لامحدود خودی سے واصل ہوکر انا کے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

نیٹشے بقائے روح کے متعلق کہتا ہے کہ خواہش اقتدار ہر ذی روح میں پائی جاتی ہے لیکن اس خواہش میں نظام یا ترتیب نہیں، اور نہ اس کا کوئی مقصد ہے۔ اشیائے محسوسہ کے سوائے کوئی دوسری حقیقت کا وجود نہیں ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ ہمارے احساس سے

بیروں ایک اور حقیقت ہے۔ اور وہ خودی کے نام سے موسوم رہا ہے۔ انسان کی خودی زبان اور مکان کی قید سے آزاد ہو سکتی ہے۔ در اصل خودی کی ترقی بعد مرگ بھی قائم رہتی ہے۔

گو کہ اقبالؒ یوروپین مفکروں میں نیٹشے کے عقائد کو پسند کرتے رہے لیکن اقبالؒ کو مقلد محض سمجھنا جائز نہیں۔ آپ کا اسلاف کے کارناموں کو یاد دلانے اور پیغمبروں کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کے لئے ابھارنا تقلید کی حمایت نہیں بلکہ عین تقلید شکنی ہے۔ کیونکہ اجتہاد کو قرآن اور حدیث میں نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ اقبالؒ خود مجتہد تھے، وہ نہ تو کسی کے مقلد ہوئے اور نہ انھوں نے دوسروں کو تقلید کی تعلیم دی۔ آپ کا فلسفہ اور آپ کے مخصوص خیالات اور مخصوص انداز بیان اس بات پر شاہد ہیں۔ اقبالؒ نے تقلید کو غلامی سے بدتر سمجھا اور صاف الفاظ میں تقلید کی جابجا اپنے اشعار میں مذمت کی ہے۔ اگرچہ اقبالؒ کے انسان کامل اور جرمن فلسفی کے فوق البشر میں مشابہت نظر آتی ہے۔ لیکن اقبال اپنے ایک خط میں جو ڈاکٹر نکلسن کے نام ہے، اور نیرنگ خیال کے اقبالؒ نمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۵۳) میں بعنوان "فلسفہ سخت کوشی" ہے لکھتے ہیں

"میں نے آج سے تقریباً" بیس سال قبل

انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں۔

یہ مضمون انڈین انٹی کیوری میں شائع ہوا اور جب ۱۹۰۸ء میں، میں نے ایرانی الٰہیات پر ایک کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کیا گیا۔

آگے چلکر کہتے ہیں کہ ان خیالات کو نیٹشے کے بجائے الگزنڈر کے عقائد کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ متصوفین مشرق میں جن کے خیالات اقبالؒ کے خیالات سے ملتے جلتے رہیں، حسب ذیل ہیں:۔

## اقبالؒ اور عبدالکریمؒ الجیلی

۱۹۰۲ء میں اقبالؒ نے الجیلی کے انسان کامل پر (INDIAN ANTIQUARY, BOMBAY) میں ایک مضمون لکھا تھا۔ الجیلی کے عقیدۂ انسان کامل کا ذکر اس مقالے کی تمہید میں ہو چکا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو کامل ہونے کے لئے تین درجوں سے گذرنا پڑتا ہے جس کے بعد وہ صفات ربانی اور انسانی کا مجموعہ بن جاتا ہے اور محافظ کائنات کہلاتا

ہے. اس کے نور میں خدا اپنے حسن و جمال کو مشاہدہ کرتا ہے. اقبالؒ کا مرد مومن بھی پیکر انسانی میں صفات الہٰی کے جلوے دکھاتا اور اپنی سوسائٹی کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے. لیکن الجیلی کے مرد کامل سے اقبالؒ ایک قدم اور بڑھ کر کہتے ہیں کہ مرد مومن کے لئے ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے۔ اس میں نور و حرارت دونوں موجود ہونے چاہئیں۔

## اقبال اور ابن العربی

ابن العربی کے عقائد کا ذکر بھی تمہید میں کیا جا چکا ہے۔ ابن العربی کے لئے انسان اپنے اعمال کی بناء پر کامل اور واصل حق ہو سکتا ہے. اقبالؒ کے مانند یہ فرماتے ہیں کہ وصل کے معنے فنا نہیں، بلکہ عین وصل میں انسان کی صفت بشری باقی رہتی ہے اقبالؒ کی طرح ابن العربی بھی خود شناسی کو خدا شناسی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ شریعت کی پیروی انسان کو خود آموزی کی تعلیم دیتی ہے. روحانی تعلیم و تربیت کے لئے پیر کامل کی جو "ابوالوقت" ہو ضرورت ہے۔ انسان کامل ہونے کے لئے اس کو تین منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے.

## اقبالؒ اور مولانا رومؒ

متصوفین مشرقی میں اقبالؒ کے خیالات سب سے

بڑھ کر مولانا رومؒ کے خیالات سے مشابہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں متعدد مرتبہ مولانا رومؒ سے اظہار عقیدت کیا ہے۔

صحبتِ پیر رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بکف

راز معنی مرشد رومی کشود
فکرِ من بر آستانش در سجود

(زبور عجم)

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

(بال جبریل) صفحہ ۴۴

بیا کہ من ز خمِ پیر رومؒ آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

(پیام مشرق) صفحہ ۱۹۵

درحقیقت اقبالؒ کے خیالات میں حرکت مولانا رومؒ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اسرار خودی کی تصنیف کی محرک مولانا رومؒ کی مثنوی ہی تھی۔ اس کتاب کی تمہید میں اقبالؒ مولانا کی خدمت میں اپنے گہائے عقیدت کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ رومؒ
دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم
جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار
من فروغِ یک نفس مثلِ شرار
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

پھر فرماتے ہیں کہ مولانا رومؒ کے حسب الارشاد اسرار خودی سے پردہ کشائی کی گئی ہے۔ نیز اقبالؒ کو "جاوید نامے" میں مولانا رومؒ کی ہی صحبت میں معراج نصیب ہوتی ہے۔

مولانا رومؒ نے شعر و شاعری کو اپنے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اور تصوف کے رنگ سے ان کو جلا دی۔ اقبالؒ نے بھی اسی طرح اپنے فلسفیانہ خیالات کو تصوف کی چاشنی میں تر کرکے شاعری میں ظاہر کیا۔ مثنوی رومیؒ "قرآن بزبانِ پہلوی" کے لقب سے ملقب ہے۔ اس طرح اقبالؒ کی مثنوی اسرار خودی کو قرآن ہندوستان کہا جا سکتا ہے۔ مثنوی چھ دفتر اور (۲۶۰۰۰) ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے مقابلہ میں گو کہ اسرار خودی کا حجم بالکل کم ہے لیکن اقبالؒ کی یہ تصنیف ان کے خیالات کی جامع اور مکمل تصویر ہے۔ سچ ہے "شاعری

جزولیت از پیغمبری " بلندی تخیل ۔ احساس قلب اور تصور اشیائے غیر محسوسہ جو شاعری کے لوازمات ہیں صفات پیغمبری میں داخل ہیں ۔ مولانا کے تصوف اور اقبالؒ کے عقاید میں غیر معمولی مماثلت نظر آتی ہے ۔ دونوں کی شاعری حکیمانہ اور وجدانی ہے۔ دونوں کے لئے تقویت خودی قربت الٰہی کا ذریعہ ہے۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق بھی دونوں ہم خیال ہیں یعنی دونوں امور طبعی میں جبر کے اور باقی کل افعال میں اختیار انسان کے قائل ہیں ۔ دونوں صاحب رجا ہیں اور دونوں کے لئے نزول آدم باعث عروج انسانی ہے ۔ دونوں سعی کے طرفدار اور جمود کے مخالف ہیں دونوں حکمت استدلالی اور حکمت نبوی سے بطور کلی آشنا اور بقائے روح اور وجدان قلب کے معتقد ہیں ۔ دونوں کے نزدیک عشق کا درجہ عقل سے بالا تر ہے ۔ دونوں قواء دل کے قائل اور دل کو وصل حق کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔

مولانا کا دیوان " دیوان شمس تبریز " ان کے جذبۂ عشق کا آئینہ ہے ۔ جس میں انھوں نے عشق کو اصل کائنات قرار دیکر اس کی کیفیتوں اور قواعد کا ذکر نہایت ہی پر اثر الفاظ میں کیا ہے ۔ اقبالؒ بھی متعدد نظموں میں عقل و عشق کا مقابلہ کرکے قواء

عشق کی برتری کو ثابت کرتے ہیں۔ دونوں موسیقی کو جذبۂ عشق کے ابھارنے کا ذریعہ قرار دیتے ہیں دونوں کے لئے موسیقی اصلیت کا آئینہ ہے۔ مولانا کی مثنوی "نے" کے دردناک نالے سے شروع ہوتی ہے۔ جو اپنے نیستاں سے جدا ہوکر مصروف ماتم اور اس سے پیوست ہونے کے لئے بے چین ہے۔ اقبالؒ اور رومی دونوں کے عقاید کی بنیاد مذہب پر ہے' دونوں احترام انسان اور نیابت الٰہی کو مانتے ہیں اور دونوں شعر و شاعری کو روحانی لذانت کا باعث سمجھتے ہیں۔ اور دونوں مرشد کامل کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں۔

مولانا رومؒ کے مانند اقبالؒ کی تعلیم بھی تعصب سے بری ہے۔ فرماتے ہیں اختلاف عقائد کو جنگ و جدال کا باعث مت قرار دو۔ افعال بیرونی کو نیت اور ارادے کے مقابلے میں ترجیح نہیں ہے۔

عقیدۂ ارتقائ میں بھی اقبالؒ اور مولانا متفق ہیں۔ دونوں کا عقیدہ ہے کہ ہیولی مبدل ہوکر جماد ہوا پھر کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جمادات نے نباتات کی شکل اختیار کرلی۔ جو بتدریج حیوان اور انجام کار انسان کے درجے تک پہنچا ہے۔ اس روسے ممکن ہے کہ انسان بتدریج خصائل ملکی۔ ملکوتی اور لاہوتی سے مزین ہوکر اصل مجرد سے واصل ہو جائے۔

اقبالؒ کے مانند مولانا بھی تقلید کورانہ کے سخت مخالف ہیں، فرماتے ہیں :-

گوش داری تو بگوشِ خود شنو
گوش گولاں را چرا باشی گرو
بے ز تقلیدی نظر را پیشہ کن
ہم برائے عقلِ خویش اندیشہ کن

مولانا رومؒ فرماتے ہیں امید طاقت وروں کی خصلت ہے۔ نقصان کا خوف جد و جہد کو مفلوج کر دیتا ہے۔ امید انسان کو برسرِکار رکھتی اور آتش کو پنبہ کے مانند نرم بنا دیتی ہے۔ صاحبِ رجا کے ہاتھ میں آہن موم ہو جاتا ہے۔ مصائب و آفات کو بُرا نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ انکے در پردہ عنایاتِ الٰہی پوشیدہ رہتے ہیں۔ جیسا کہ بہار موسمِ خزاں میں پوشیدہ ہے اور خزاں بہار کے بعد آتی ہے اور میوے کے سخت پوست کے دور کرنے کے بعد نرم مغز نکل آتا ہے۔ رنج و راحت خوشی کی زیادتی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک آفت اس سے بڑھی چڑھی دوسری آفت کو دفع کرتی ہے۔ آفات میں مبتلا کر کے انسان کو تکلیف پہنچانا مقصودِ الٰہی نہیں ہے بلکہ انسان کو کامل تر بنانا مدِنظر ہوتا ہے۔ بدی نسبتی اور امر اضافی ہے۔ جیسا کہ زہر جو سانپ کے لئے باعثِ حیات ہوتا ہے انسان کی موت کا ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔

مولانا رومؒ اقبالؒ کے مانند عقل کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کرتے۔ لہذا فرماتے ہیں: بزرگی حکمت کی بلوغیت سے ہے نہ سفیدی ریش کی بناء پر۔ صاحب حکمت کی روح توانا تر ہوتی ہے۔ بمصداق "توانا بود ہر کہ دانا بود"

خاتم ملک سلیمان است علم
جملہ عالم صورت و جان است علم

تاہم علم لدنی کو عقل پر فضیلت ہے۔

انسان نائب الٰہی اور اس کا آئینہ ہے۔ جس میں حسن حقیقی جلوہ افروز ہوتا ہے۔ پس اقبالؒ اور مولانا رومؒ دونوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ جزئیات میں فرق ہے اس لئے کہ دونوں اپنے اپنے زمانے اور احول کے اعتبار سے خاص خاص امور کی تاکید کرتے ہیں۔

## اقبال اور محمود شبستری

سر اقبالؒ نے زبور عجم میں محمود شبستری کی تصنیف گلشن راز کی پیروی میں گلشن راز جدید لکھی ہے۔ جس کا بیان باب دوم میں آچکا ہے۔ اس مختصر مثنوی میں آپ محمود شبستری کی گلشن راز کے سوالات کے جواب اپنے خاص انداز میں دیتے ہیں۔ در اصل یہ مثنوی زمانۂ حاضرہ کے موافق اور باہم با مسمیٰ ہے۔ اقبالؒ اور محمود شبستری کے عقاید کے موازنہ و مقابلہ کے لیئے دونوں کے جوابات کو ایک ساتھ پڑھنا چاہیئے۔ اقبالؒ کی مثنوی کا ذکر باب دوم میں کیا جاچکا ہے

یہاں اسکا اعادہ بخوفِ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اب محمود شبستری کے جوابات ملاحظہ کیجئے۔ محمود شبستری فرماتے ہیں۔ تفکر سے مراد بطلان کثرت تعینات اور حق کی طرف رجوع کرنا ہے۔ جس میں سالک اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ کائنات ایک حقیقت مطلق کا مظہر ہے۔ جاننا چاہیئے کہ علم کشفی علم عقلی سے بالاتر ہے۔ نیز فرماتے ہیں خدا کے اسماء و صفات پر تفکر احسن اور اسکی ذات پر غور کرنا گناہ ہے۔ "میں" سے مراد وہ روح قدسی ہے جو عالم الوہیت سے متعلق اور انسان میں مقیم ہوتی ہے۔ اسکی حقیقت کو جاننے کیلئے انسان کو چاہیئے کہ خواہشات نفسانی کو نفس مطمئنہ میں فنا کر دے۔ سالک امکان سے واجب کی طرف اور تقید سے اطلاق کی طرف صعود کر جاتا ہے۔ اس پر گونا گوں کیفیات گاہے گاہے وارد ہوتی رہتی ہیں اور وہ اپنے ارادہ انفرادی کو ارادہ کلی کے تابع فرماں بنا دیتا ہے۔ اور یہ درجہ اولیاء اور انبیاء سے مخصوص ہے۔ پس اس وقت خلافتِ الٰہی کا تاج اسکے زیب سر ہوتا ہے۔ اور کل اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ اس میں مجتمع ہوتے ہیں۔ وہ کسی منزل میں قیام کرنے کے بغیر واجب کی طرف سفر کرتا جاتا ہے۔ اسرار وحدت اس پر عیاں ہوتے ہیں اور کثرت میں وحدت کو ملاحظہ کرنے لگتا ہے۔ اس کا قلب پاک اور اسکی خودی نابود ہو جاتی ہے۔ علم لدنی سے بے حد محظوظ ہوتا ہے

تزکیہ نفس کیلئے طہارت جسمانی۔ گناہ اور شرک سے دوری اور اخلاق ذمیمہ سے پرہیز اور پاکیزگی نیت ضروری ہے چونکہ انسان ہستی اور نیستی سے مرکب ہے بمقتضائے جزو ہستی علوم معرفت حقائق کی خواہش رکھتا ہے۔ اور اس خواہش کا نام عشق ہے۔ لیکن عشق سے بھی دوئی پائی جاتی ہے جس میں عاشق و معشوق کا اپنی ذات میں جدا جدا قیام لازمی ہوتا ہے۔ سالک حقیقی کے لئے منزل عشق بھی دائمی نہیں ہوتی۔ بلکہ عاشق معشوق کی ذات میں اپنی ہستی کو فنا کرکے دوئی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس عقیدے میں اقبالؒ اور محمود شبستری کا فرق نمایاں ہے۔ اقبالؒ انفرادیت کے فنا ہونے کے نظریہ کے سخت مخالف ہیں۔ وصال حق کو بھول میں ہو کے ہاتھ لینا سمجھتے ہیں۔

نیز شبستری کا عقیدہ ہے کہ انسان کامل کا جزو الہیت اسکو انا الحق کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی یہ کہنا ہے کہ عاشق و معشوق یا عارف و معروف کا امتیاز جاتا رہا اور یہ کہنا دلیل وصل حق ہے۔

فرماتے ہیں کہ وجود ممکنات خیالی ہے صرف ایک وجود مطلق کل عالم پر حاوی ہے۔ اقبالؒ دنیا کو سراب سمجھنے سے انکار کرتے ہیں۔ آپ کے لئے دنیا حقیقی اور میدان عمل اور انسان کی جائے آزمائش ہے۔ یہاں رہ کر انسان اپنی خودی کو تقویت پہنچاتا اور روحانی قوتوں کو بڑھا سکتا ہے۔

وصال ممکن و واجب قریب و بعید کے متعلق محمود شبستری فرماتے ہیں، خدا مبداء نور ہے اور ہر چیز اپنی استعداد اور مقام کے مطابق اس سے منور ہوتی ہے۔ جو اشیاء کہ اس سے نزدیک تر ہوتے ہیں وہ بہ نسبت ان اشیاء کے جو دور تر رہتی ہیں روشن تر ہو جاتی ہیں۔ مسئلہ قضاء و قدر کے متعلق محمود شبستری اپنے ارادے کی تسلیم اختیاری کو احسن سمجھتے ہیں۔ اور عموماً عقیدہ قدر کے پیروں کا خیال رہا ہے کہ محمود شبستری کا عقیدہ جبر و اختیار کے درمیان ہے لیکن میں نے جو اس عقیدہ کی روشنی میں آپکی تصنیف گلشن راز کو بار بار پڑھا تو مجھے محمود شبستری بہ نسبت اختیار کے جبر کی طرف زیادہ مائل نظر آئے۔

وہ فرماتے ہیں حقیقت سمندر ہے جس کا کنارہ کلام ہے جو اسرار حقائق کو منسلک کرتا ہے۔ لیکن کلام صورت محض ہے۔ اور کلام کے معنی در اصل اہم ہیں۔ اس طرح بیرونی افعال بغیر خوش عقیدگی، ایمان اور نیت کے اعلیٰ ترین فضائل نہیں سمجھے جا سکتے۔ چاہئے کہ علوم دینی کو جو تزکیہ نفسی کا ذریعہ ہیں تحصیل کریں۔ اور آفاق اور انفس سے سبق حاصل کریں۔ افلاطون کے مانند محمود شبستری نضائل چہارگانہ یعنی عدالت۔ حکمت۔ عفت و شجاعت کا ذکر کرکے ہر فضیلت کے افراط و تفریط کے درمیانی حصے کو نیکی قرار دیتے ہیں۔

# خاتمہ

پس اقبالؒ کے عقائد کے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ مغربی مفکرین میں سے انھوں نے نیٹشے کے عقائد کو بہ نظر پسندیدگی دیکھا۔ لیکن ان پر مولانا رومؒ کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ گو کہ محمود شبستری کے متعلق اقبالؒ نے اپنے خیالات کو اپنی کسی تصنیف میں بھی ظاہر نہیں کیا ہے۔ تاہم آپ کی گلشن راز جدید ان دونوں کے مقابلے اور موازنہ کے لئے بہترین تصنیف ہے۔ لیکن اقبالؒ کے عقائد پر سب سے بڑھ کر انکے ماحول کا اثر ہوا اقبالؒ نے مسلمانوں کی زبوں حالی اپنی آنکھوں سے دیکھی مسلمانوں کی شان و شوکت کی یادگاریں ہمیشہ آپ نے پیش نظر رکھیں۔ آپ کے ذہن رسا نے پالیا، کہ اغیار کن کن تدابیر اور حکمتوں سے مسلمانوں کی بربادی کا دام بچھا رہے ہیں۔ اقبالؒ کی سریع الحس طبیعت نے مسلمانوں کے گزشتہ جاہ و جلال کا موجودہ پستی سے مقابلہ کیا۔ اور آپ کی دور بینی نے اس انقلابِ عظیم کے وجوہات دریافت کئے۔ اور جو کچھ آپ کی فکر و جستجو کا نتیجہ تھا اُسے آپ کی فلسفیانہ

طبیعت نے ایک انوکھی حکمت میں اور آپکی شاعرانہ فطرت نے الفاظ کے موتیوں میں ڈھال دیا جو آج آپکی متعدد تصانیف کی شکل میں ہمارے لئے باقی رہ گئے۔ اقبالؒ کیلئے تصوف کا مفہوم بے انتہا وسیع ہوگیا ہے۔ یادِ خدا پاکیزگیٔ اخلاق۔ احترام شریعت کے ساتھ ساتھ عزت نفسی اور معرفت خودی بھی ضروری تصور کئے گئے۔ اقبالؒ نے ببانگ دھل کہہ دیا کہ سالک کے دل سے دنیا کے نفع اور ضرر کا اندیشہ اس وقت تک محو نہیں ہوسکتا تا آنکہ اسکو شجاعت و مردانگی کی تعلیم نہ دی جائے۔ ہندو۔ جین و بودھ مذاہب کے برخلاف خواہشات کو معدوم کرنیکے بجائے اقبالؒ کے تصوف میں آرزو اور تمنّا کو خاص جگہ دیگئی۔ آپ نے ہندوؤں کے عقائد کرمہ اور تناسخ کی جگہ مسلمانوں کے خاص عقیدہ ثواب عقاب اور بقائے روح پر زور دیا۔ آپ نے سنیاسی زندگی کی سخت مخالفت کی۔ گو کہ بھگوت گیتا کی تعلیم اور ویدانتیت کے عقائد کے بموجب آپ بھی عشق اور محبت کو معراج کمال کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن آپکا لائحہ عمل ان فرقوں سے یکسر بیگانہ ہے۔ بودھ۔ جین مذاہب کے قانون بے آزاری (آہنسہ) کے ناقابل عمل غلو کے آپ قائل نہیں۔ مذہب زرتشت جس کی بنیاد دو مختلف قواء نیکی و بدی پر رکھی ہو اقبال جیسے پرستار توحید کو کیوں کسی آنکھ بھائے۔ گو کہ اس مذہب کا فلسفہ اخلاق جسکی بناء اصول سہ گانہ یعنی پندار نیک۔ گفتارِ

نیک اور کردار نیک پر ہے باعث ستائش ہے - اور اس مذہب کے عقائد ثواب و عقاب اور روز قیامت اور............ (SOCIAL ETHICS) اصول اخلاق سوسائٹی) عقائد اسلام سے ملتے جلتے ہیں لیکن ان کی مادی ترقی کی یک طرفہ تاکید شعار اسلام کے خلاف ہے۔ جسکی رو سے مادیت اور روحانیت کو دست بگریباں ہونا چاہیے۔ نیز مانی اور مزدک کے عقاید عزلت اور لذات دنیوی سے دوری جو ان مذاہب پر بودھ ہولوں کے اثر کا نتیجہ تھے۔ اقبالؒ کے لیے باعث تنفر تھے۔

یونانیوں کے عقائد فلسفہ دولت عباسیہ کے زمانے میں ترجموں کے ذریعہ مسلمانوں پر واضح ہو چکے تھے۔ بنابرایں مسلمانوں میں بعض فرقے معتزلہ کے مانند پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے فلسفہ اور اصولِ اخلاق کی بناء عقل پر رکھی اور مسئلہ (INTUITION) (وجدان) ان کیلئے ایک بے معنی مسئلہ ہو گیا۔ بعض نے افلاطون کی پیروی کی اور بعض نے ارسطو کی پیروی کو باعث فخر سمجھا۔ نو افلاطونیت کے عقائد ایک فرقہ کے نزدیک بے انتہا مقبول ہوئے۔ دوسری طرف سے عیسائیوں کا عقیدہ رہبانیت اس فرقے کی جاذب نظر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فرقے نے ایک ایسے تصوف کی بنا ڈالی جو تعلیم قرآن اور ہدایت پیغمبر سے علیحدہ اور یونانی اوہام۔ مذہبی مراسم کا معجون مرکب اور منفی تصوف کا حامی

بن گیا۔ اقبالؒ نے دیکھا کہ ہمارے متصوفین نفس پر غلبہ پانے کی کوششوں میں کسی طرح خود ہی مفتوح و مغلوب ہوتے ہیں۔ اور کس طرح اُن کے قواء جسمانی اور روحانی مضمحل ہو رہے ہیں۔ اس کے خلاف اقبالؒ نے جہاد کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ اور ایسے جدید تصوف کی بنیاد ڈالی جس میں خودی خود افزائی سے انسان کی حوصلہ افزائی ہو۔ آپ کے تصوف میں عشق و عقل ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ عقل سے حقیقت کے ظاہری پہلو کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اور عشق سے حقیقت کے باطنی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

اقبال دنیاوی معلومات کا معیار عقل اور معاملات دینی کا معیار وجدان سمجھتے ہیں۔

اقبالؒ نے ایک ایسے زمانے میں جنم لیا جب مسلمانوں کا ادبار اور انکی تباہی حد سے گذر چکی تھی۔ صوفی جہاد بالنفس کی تاکید کرتے تھے اور دنیا کی بے وقعتی کا چرچا کرکے سود و زیاں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا دل انقلاب زمانے سے اتنا افسردہ ہو چکا تھا کہ انکی نظروں میں دنیا کی ہر چیز حقیر معلوم ہونے لگی تھی۔ اور ہر طرف بیجا توکل سستی اور آرام طلبی کا دور دورہ تھا۔ اقبالؒ نے اپنے زمانے کے ان رجحانات کی مخالفت کی اور علی الاعلان اپنے ماحول سے جہاد کرتے ہوئے انسان کی برتری کا دعویٰ کیا

اس کو نہ صرف کل معلومات پر حکمراں بنایا بلکہ بندگی میں وہ لذت اور لطف محسوس کیا کہ اس کے عوض خدائی لینے پر راضی نہ ہونے لگے۔

تصوف مروجہ کے فلسفۂ منفی کے مقابلے میں جو ہنود کے سنیاسی اور عیسائیوں کی رہبانیت کے زیر اثر تشکیل ہوا تھا۔ آپ نے اثباتی تصوف کی بنیاد ڈالی اور علی الاعلان فرمادیا کہ مقصد حیات انسان کا ذات حق میں ملکر فنا ہونا نہیں، بلکہ نامحدود معشوق کا محدود شئے کے آغوش میں آجانا ہے۔ اس مقصد کی تحصیل میں حتی الامکان سعی و کوشش کرنی چاہیئے۔ اقبالؒ دنیا کو زشت سمجھکر اس سے کنارہ کش ہونا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ خطروں سے مقابلہ کرنا اور کش مکش حیات میں مبتلا ہونے کو عین زندگی سمجھتے ہیں۔

نیز اقبالؒ نے خودی کو مفہوم عامہ کے برخلاف خودداری و عزت نفسی سے تعبیر کیا۔

اقبالؒ کی نظر میں صرف انسان ہی خدا کا طالب نہیں بلکہ خدا بھی انسان کا جویا اور وصال انسان کے لئے بیتاب ہے

اقبالؒ کا فقر باوقار اور بادشاہت، کا مرادف ہے نہ کہ توکل و افلاس کے ہم معنی۔

نرے صوفی کا کلام سرد اور افسردہ ہوتا ہے لیکن اقبالؒ کے کلام کا جزوِ اعظم سوز۔ جوشش، اور ہنگامہ آرائی

ہے۔ صوفی تقلید کو ایمان کا ہم ردیف سمجھتے تھے۔ لیکن اقبالؒ اجتہاد کے علمبردار اور تقلید کورانہ کے سخت منکر ہیں۔ صوفیوں کے لئے شیطان قوت بدی ہے۔ جس سے احتراز لازمی ہے۔ لیکن اقبالؒ نے برائی اور بھلائی کو ایک ہی جوہر کے دو پہلو قرار دے کر شیطان کو مجسمہ بدی قرار دینے کے بجائے اس کو انسانی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں کا باعث قرار دیا ہے۔

اس طرح اقبالؒ نے اپنے کلام سے ہندوستانی زوال یافتہ و افسردہ دل اقوام کو احساس زندگی اور جد و جہد اور عمل پیہم کی تعلیم دے کر انکو مائل بکار کیا۔ اور مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ آپ کا پیام، پیام زندگی ہے۔ اور یہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ کل نوع انسانی کے لئے ہے اسی لئے دنیا کے اہل فکر اور اہل بصیرت لوگوں میں اقبالؒ کا درجہ نہایت بلند ہے۔

گو اقبالؒ اس وقت ہمارے درمیان نہیں۔ لیکن آپ کے خیالات آسمان ادب پر درخشاں ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ قلب انسانی پر آپ کے بیش بہا خیالات کا اثر تا ابد باقی رہے گا۔ اسی لئے اقبالؒ زندہ جاوید ہیں۔

# علیحات

باب اوّل کے ماخذ (۱) بانگِ درا

(۲) "اقبال" مصنفہ احمد دین صاحب

بی۔ اے

(۳) IQBAL, HIS POETRY AND MESSAGE BY SHAIK AKBER ALI

(۴) فلسفۂ عجم مصنفہ حسن الدین صاحب

بی اے۔ ال ال۔ بی

باب دوم کے ماخذ (۵) اسرارِ خودی

(۶) رموزِ بے خودی

(۷) پیامِ مشرق

(۸) زبورِ عجم

(۹) RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM.

باب سوم کے ماخذ (۱۰) جاوید نامہ

(۱۱) بالِ جبریلؑ

(۱۲) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

مع مسافر

(۱۳) ضربِ کلیمؒ
(۱۴) ارمغانِ حجاز
(۱۵) "سب رس" اقبال نمبر بعنوان اقبالؒ کا آخری کلام ص۱۲۱

باب چہارم کے ماخذ — مذکورہ کتابوں کے علاوہ
(۱۶) جوہر اقبالؒ (رسالہ جوہر اقبالؒ نمبر ۱۹۳۸ء)
(۱۷) اردو (رسالہ اردو اقبالؒ نمبر ۱۹۳۸ء)
(۱۸) نیرنگِ خیال (اقبال نمبر ۱۹۳۲ء)
IQBAL'S EDUCATIONAL PHILOSOPHY BY K.G. SAIYIDAIN, B.A.M.ED (LEEDS)
(۲۰) IQBAL'S PHILOSOPHY OF SOCIETY BY B.A DAR.M.A
(۲۱) ASPECT OF IQBAL AND مقالات یوم اقبالؒ

باب پنجم کے ماخذ:
(۲۲) انسکلو پیڈیا۔ بری ٹانیکا (برگسان۔ نیٹشے)
(۲۳) انسکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھیکس (نیٹشے)

(۲۴) مثنوی رومیؒ

(۲۵) INTRODUCTION OF MODERN PHILOSOPHY BY C.E.M. JOAD (BERGSON'S PHILOSOPHY

(۲۶) گلشن راز از محمود شبستری

---

## ان کتابوں کے علاوہ مضامین ذیل سے خاص مدد لی گئی

---

"اقبال اور نیٹشے" پر (ASPECT OF IQBAL) کے صفحہ ۱۰۲ - میں جناب ایم - عمر فاروق ایم - اے نے ایک مضمون لکھا ہے۔

---

نیرنگ خیال کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ء "اقبال اور فلسفہ مغرب" از پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی - اے صفحہ ۳۶۳۔

---

رسالہ اردو اقبالؒ نمبر ۱۹۳۸ء "رومی - نیٹشے اور اقبالؒ - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔

---

(تمہید کے مضامین کے ماخذوں کی
فہرست ابتداءً ہی میں دی جا چکی ہے)